عدد ۱ — و قد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین ۞ — ۲۰

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جنوری ۷۶ء

★

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۲۔۱ افغانی روڈ ۔ سمن آباد ۔ لاہور
(فون : 413945)

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد ۲۳	جنوری ۱۹۷۶ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

- تذکرہ و تبصرہ ● اسلام برصغیر پاک و ہند میں ڈاکٹر اسرار احمد
- ● ایک اہم وضاحت — مولانا شمس الحسن خطیب جامع مسجد خضراء کراچی
- مقالات ● حفاظت متن قرآن (۳) — حافظ احمد یار صاحب
- ● اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل — مولانا امین احسن اصلاحی ۲۶
- ● حج اور عیدالضحیٰ اور ان کی اصل روح — ڈاکٹر اسرار احمد ۳۷
- ایک مکتوب — ڈاکٹر شیر بہادر خاں نی
- افکار و آراء ● تدبر قرآن ایک مفسر قرآن کی نظر میں — مولانا عبدالماجد دریا بادی

مولوی محی الدین (ناشر) نے باہتمام چوہدری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور سے چھپوا کر دفتر انجمن خدام القرآن ، ۱۲ افغانی روڈ
سمن آباد لاہور سے شائع کیا

اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

برِّصغیر پاک و ہند میں خورشیدِ اسلام اوّلاً عینِ غرب یعنی مکران اور بلوچستان کے افق پر خلافتِ بنی اُمیّہ کے زمانے میں اس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے انتقال پر اسّی برس[1] بیت چکے تھے اور دورِ خلافتِ راشدہ کو ختم ہوئے بھی نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گذر چکا تھا اور اسلام کے صدرِ اوّل کا جوش و خروش کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کے حکم میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرزمینِ ہند پر 'بابُ الاسلام' سندھ کے راستے اسلام کا یہ ورودِ اوّل بھی کسی مثبت تبلیغی جذبے یا احساسِ فرض کا مرہونِ منّت نہ تھا بلکہ ایک وقتی اور فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلام کی کرنیں موجودہ پاکستان کے بھی صرف نصف جنوبی کو منوّر کر کے رہ گئیں اور اس مدّ میں بھی جذر کے آثار فوراً ہی شروع ہو گئے اور برِّصغیر پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمدِ اوّلین نہایت محدود بھی رہی اور حد درجہ عارضی بھی۔

گویا سرزمینِ ہند دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کی برکات سے تو مطلقاً محروم ہی رہی جس میں ایمان اور یقین کا کیف و سرور اور جہاد و قتال کا جوش و خروش باہم شیر و شکر تھے اور جہاد کی اصل غرض و غایت فریضۂ شہادت علی النّاس کی ادائیگی کا جذبہ تھا یا حصولِ مرتبۂ شہادت[2] کا ذوق و شوق نہ کہ ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس

---

[1] آنحضور کا سنِ وفات ۶۳۲ء ہے اور سندھ پر محمد بن قاسمؒ کا حملہ ۷۱۲ء میں ہوا۔ [2] بقول علامہ اقبال ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص۔ مزید محرومی یہ رہی کہ اسے اس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات سے متمتع ہونے کا موقع بھی بہت ہی کم ملا جس میں دین و دنیا کی وحدت و یگانگت ابھی اس حد تک باقی تھی کہ رات کے راہب ہی دن کے شہسوار[1] ہوتے تھے اور ایک ہی انسان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار!

بعد ازاں جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تو اسلام کے انوار و برکات کا ترشح عرب تاجروں کی آمد و رفت کے طفیل تقریباً مسلسل ہوتا رہا اگرچہ اس کی نوعیت ایک ہلکی سی پھوار یا دھیمی سی آنچ کی تھی جس کے اثرات زیادہ محسوس و مشہود نہیں ہوتے ——— لیکن شمال مغربی سرحد پر واقع پہاڑی درّوں سے اسلام کا سیلاب کم و بیش تین صدیوں بعد شروع ہوا اور مزید لگ بھگ دو سو برس تک اس کی نوعیت واقعتہً پہاڑی ندی نالوں کے سیلاب ہی کی سی رہی کہ زور و شور اور غیظ و غضب کے ساتھ آیا اور آناً فاناً گذر گیا۔ اور اگرچہ اس بار موجودہ پاکستان کے نصفِ شمالی کی قسمت جاگی کہ وہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس ہی باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تاہم واقعہ یہی ہے کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کی اصل حیثیت پہاڑی نالوں کے سیلاب سے زیادہ نہ تھی جو ادھر آتا ہے اُدھر گذر جاتا ہے!

تختِ دہلی پر مسلمانوں کو باقاعدہ تمکّن ۱۲۰۶ء کے لگ بھگ حاصل ہوا، اور ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ حکومت عروج و زوال اور مدّ و جزر کے مختلف مدارج و مراحل سے گذرتا ہوا ۱۸۵۷ء کے غدر پر ختم ہو گیا۔ ان ساڑھے چھ سو سالوں کے نصف اوّل کے دوران، یعنی ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پہلے کچھ ترکی النّسل غلام بادشاہ[2] تختِ دہلی کو زینت بخشتے رہے اور بعد ازاں کچھ افغان خاندان (خلجی، لودھی وغیرہ -)

---

[1] رستم، سپہ سالار افواجِ ایران کو اس کے مخبروں نے مسلمان افواج کے جو حالات بتائے تھے ان میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ "هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ" یعنی "وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار!" [2] اگلے صفحہ پر دیکھئے

حکمران رہے، اور نصف ثانی یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک مغلوں کا دور ہے جس کے کل سوا تین سو سالوں میں سے پہلے پونے دوسو برس[1] اس کی اصل عظمت وسطوت کا زمانہ ہے اور بعد کے ڈیڑھ سو برس اصلاً ایک عظیم عمارت کے کھنڈروں میں تبدیل ہونے اور بالآخر زمیں بوس ہو جانے کا عرصہ! (ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی"!)

گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ اپنی نشأۃِ اُولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار ہو چکا تھا۔ اور اس کی وحدتِ فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدتِ ملّی بھی۔ چنانچہ ایک طرف عالمِ اسلام کے قلب میں عرب قوّت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور خلافتِ بنی عبّاس کا دیا چراغ سحری کے مانند ٹمٹما رہا[2] تھا اور پوری مملکت طوائف الملوکی کا شکار تھی گویا بنی اسمٰعیلؑ کے حق میں وعیدِ خداوندی "اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ" پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی ——— اور دوسری[2] طرف خلافتِ اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستانِ پارینہ بن چکی تھی جس میں دین و دنیا کے مابین کوئی دُوئی تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی جدائی اور خدا کے جلال و جمال[3] کے

۲ے تاریخ اسلام کا یہ دَور عجیب ہے کہ از شرق تا غرب غلاموں ہی کی حکومتیں قائم تھیں۔ چنانچہ ہند میں خاندانِ غلاماں حکمران تھا تو مصر میں مملوک سریر آرائے مملکت تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں تک پہنچایا!۔

۱ے یعنی ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمۃ کی وفات تک!

۲ے چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے آغاز کے نصف ہی صدی کے اندر اندر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد میں وہ قتل عام ہوا کہ الامان و الحفیظ ——— اور آخری عبّاسی خلیفہ مستعصم باللہ اس طرح سرِعام ذبح کر دیا گیا جیسے کسی بھیڑ یا بکری کو حلال کر دیا جائے۔ جس پر خون کے آنسو بہائے شیخ سعدیؒ نے :-

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں ——— بر زوالِ مُلکِ مُستعصم امیرالمؤمنیں!

اے محمدؐ گر قیامت سر برون آری ز خاک ——— سر برون آر و قیامت در میانِ خلق بیں

۳ے شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود ——— فقرِ جُنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

مظاہر جدا تھے نہ سلطانی و درویشی کے مصداق مختلف! ——— اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی کے ضمن میں مُلوک، اَحبار اور رُہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث[1] پوری طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سوا دُنیا کی تہذیبوں اور تمدّنوں کا جزوِ لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھا عہدِ تابعینؒ ہی میں حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر[2] میں ؎

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُھْبَانُھَا

اور اگرچہ اسلام کے اعجاز نے اس دَورِ زوال و انحطاط میں بھی بہت سی عظیم اور استثنائی (EXCEPTIONAL) شخصیتیں پیدا کیں جیسے صلاح الدّین ایوبیؒ اور ناصر الدّین محمودؒ ایسے 'درویش بادشاہ' اور امام ابن تیمیہؒ ایسی جامعِ سیف و قلم شخصیت، تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دَور تک ایک[1] جانب مسلمان حکمراں و سلاطین اکثر و بیشتر "آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ[3]" کے مصداقِ کامل بن چکے تھے اور دوسری

---

[1] گویا علامہ اقبالؒ کا یہ شعر کہ ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ظاہری طور پر بھی مطابق واقعہ ہے اور معنوی طور پر بھی۔ خصوصاً تاریخ اسلام کے اس دَور میں جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے ایک طرف تثلیث کے فرزندوں نے صلیبی جنگوں سے عالمِ اسلام کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور دوسری طرف یہ معنوی تثلیث اسلام کی وحدانیّت کی جڑیں کھوکھلی کر چکی تھی!

[2] حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ کے اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی کی ہے علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں: ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کُشتۂ مُلّائی و سُلطانی و پیری!

[3] علامہ اقبال مرحوم نے الفاظِ قرآنی " اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً (سورۃ النّمل: ۳۴) کے حوالے سے کس قدر عمدہ اشعار کہے ہیں: اشعار اگلے صفحہ پر دیکھئے

جانب علماء و صوفیاء کی عظیم اکثریت بھی آیاتِ قرآنی: "لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبَّانِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ" (المائدہ: ۶۳) اور "اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" (توبہ: ۳۴) کی مظہرِ اتم بن چکی تھی۔ فَوَاحَسْرَتَا وَيَا اَسَفَا!

ہندوستان میں اسلام وارد تو ایسی منقسم حالت میں ہوا تھا کہ اصحابِ سیف وسناں جدا تھے اور صاحبانِ قرطاس و قلم جدا، اور زیبِ منبر و محراب اور تھے اور زینتِ میدانِ جنگ و قتال اور، چنانچہ ابتداء میں ایک جانب محمود غزنوی اور محمد غوری کی سرفروشانہ تر کتازیاں تھیں اور دوسری جانب شیخ اسمٰعیل بخاری اور شیخ علی ہجویری رحمہما اللہ کی تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تربیت کی انتھک کوششیں، اور بعد میں ایک طرف قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی کی تلواریں مملکت کی توسیع اور استحکام کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں تو دوسری طرف خواجگانِ سلسلۂ چشت رحمہم اللہ نفوس کے تزکیے، قلوب کے تصفیے اور سیرت و کردار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ تاہم غنیمت ہے کہ آغاز میں ان دونوں حلقوں کے مابین گہرا ربط و تعلق موجود تھا جس کا عظیم ترین نشان (SYMBOL) ہے سلطان التمش کی جامع الصفات شخصیت کہ ایک طرف ایک عظیم مملکت کا حکمران بھی تھا اور دوسری طرف خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا حلقہ بگوش اور حد درجہ عابد و زاہد انسان بھی ——— یہاں تک کہ حضرتِ خواجہ کے انتقال پر جب

اشعار متعلقہ حاشیہ صفحہ سابقہ

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری!

لوگ نمازِ جنازہ کے لیے جمع ہوئے اور وہاں خواجہ مرحوم کی اس وصیت کا اعلان کیا گیا کہ میری نمازِ جنازہ صرف وہ شخص پڑھائے جس نے عمر بھر کبھی زنا نہ کیا ہو اور جس کی نہ کبھی تکبیرِ اُولیٰ فوت ہوئی ہو نہ عصر کی سنّتیں چھوٹی ہوں، نتیجۃً مجمعے پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور تمام لوگ حیران و پریشان ہو کر رہ گئے کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے جس میں یہ ساری شرطیں پوری موجود ہوں تو قدرے تأمّل و انتظار کے بعد جو شخص اگلی صف سے امامت کے لیے نکلا وہ خود بادشاہِ وقت سلطان التمش تھا۔!

لیکن جلد ہی یہ رابطہ کمزور پڑ گیا اور رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کے مابین ایک بُعد اور فصل پیدا ہو گیا اور اُن کے شب و روز ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بالکل متضاد ہو گئے اور جیسے جیسے وقت گزرا یہ خلیج عمیق سے عمیق تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

مزید برآں، ہندوستان میں اسلام علاقۂ ماوراء النہر سے آیا تھا جہاں خود مذہبی حلقوں میں مدرسہ و خانقاہ کی تقسیم راسخ ہو چکی تھی اور اُن کے مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی فقہ، اشعری و ماتریدی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور ان سب کے معجونِ مرکّب علمِ کلام کا دور دَورہ تھا، اور خانقاہوں میں وحدتُ الوجود کا سکّہ رواں تھا۔ لہٰذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت انہی دو ستونوں پر استوار ہوئی یعنی ایک شدید حنفیّت اور دوسرے وجودی تصوّف۔

قرآنِ حکیم یہاں ابتداء ہی سے صرف ایک کتابِ مقدّس کی حیثیّت سے متعارف ہوا اور علمِ حدیث سے یہ سرزمین دیر تک نابلد محض رہی اور چونکہ عربی یہاں صرف اعلیٰ علمی حلقوں تک محدود رہی اور عام بول چال، تصنیف و تالیف، شعر و ادب اور سرکار دربار سب پر فارسی کا قبضہ رہا لہٰذا قرآن و حدیث سے یہ بُعد اور دُوری نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ مرورِ ایّام کے ساتھ مزید بڑھتی چلی گئی۔

اس غُلُوّ فی الحنفیّت اور بُعد عن حدیث الرّسول ؐ کے ضمن میں ایک نہایت دلچسپ لیکن ساتھ ہی حد درجہ عبرت انگیز واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب سلطان ؒ کے دربار میں ایک خاص مسئلے پر شیخ الوقت خواجہ نظام الدّین اولیاء اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدّین کے مابین مناظرہ ہوا اور اپنے موقف کے حق میں بطورِ دلیل پیش کرنا چاہا خواجہ نظام الدّین ؒ نے ایک حدیث رسول ؐ کو تو بلاکسی جھجک اور تأمّل کے بھرے دربار میں ڈنکے کی چوٹ کہا شیخ الاسلام نے کہ :

تو مقلّدِ ابوحنیفہ ہستی، تُرا باحدیثِ رسول ؐ چہ کار ؛ قولِ ابی حنیفہ بیار ! "	تم مقلّدِ ابوحنیفہ ہو یعنی حنفی ہو تمھیں حدیثِ رسول ؐ سے کیا سروکار ؟ اگر امام حنیفہ کا کوئی قول پیش کر سکتے ہو تو کرو !

جس پر حضرتِ خواجہ نے یہ کہتے ہوئے مناظرہ ختم کر دیا اور دربار سے اُٹھ گئے کہ :

" سُبحان اللہ ! کہ باوجود قولِ مصطفویؐ از من قولِ ابی حنیفہ ؒ می خواہند " (سیر العارفین)	سُبحان اللہ ! نبی اکرم ؐ کے فرمان کے ہوتے ہوئے مجھ سے امام ابوحنیفہ ؒ کے قول کا مطالبہ کیا جا رہا ہے !

اُوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا انسانوں کے جسموں پر' اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکّہ قلوب کی دنیا میں رواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور اُمراء و عمائدِ سلطنت کی تھی اور ان کے ساتھ بطورِ تتمّہ یا ضمیمہ منسلک تھے ائمّہ و خطباء، مدرّسین و معلّمین اور مفتی و قاضی حضرات، اور اس دُنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی کو گویا کل دین کی حیثیّت حاصل تھی ! جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ متشدّدانہ ظاہر پرستی اور قانونی مُوشگافی کا دَور دَورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب نے بالکل خشک قانونیّت کی شکل اختیار کر لی۔

دوسری طرف، تصوّف کے خانوادوں میں سے ارضِ ہند پر سب سے پہلے چشتی سلسلے نے قدم جمائے اور کم وبیش دو صدیوں تک خواجگانِ چشت ہی کا طوطی بولتا رہا۔ جیسے ہی اس سلسلے میں قدرے ضعف کے آثار پیدا ہوئے وسطی اور جنوبی ہند میں سہروردیہ اور شطّاریہ سلسلوں کو فروغ حاصل ہوا اور شمال مغرب میں خصوصاً موجودہ پاکستان کے وسطی علاقوں میں قادریہ سلسلے نے عروج پایا ان تمام سلاسل میں وحدت الوجود کو گویا اُصولِ موضوعہ کی حیثیّت حاصل تھی اور اس کے زیر اثر کیف و سرور، جذب و مستی اور وجد و رقص کا ذوق و شوق بڑھ رہا تھا اور فنافی اللہ کو شغل و سلوک کے منتہائے مقصود کی حیثیّت حاصل ہو رہی تھی جس کے باعث قوی مضمحل ہو رہے تھے اور جذبۂ جہاد تو دُور رہا جذبۂ عمل بھی سرد پڑتا جا رہا تھا!

مزید برآں ——— باطنی احوال و کوائف پر توجّہ کے ارتکاز کے باعث ظاہر کی اہمیّت کم ہوتی جا رہی تھی، طریقت کے عروج کے ساتھ ساتھ شریعت کا استخفاف ہونے لگا تھا، عشق و محبّت کی سرمستی میں پابندیٔ شریعت اور اتّباعِ سُنّت پر پھبتیاں کسی جانے لگی تھیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہمہ اوستی نظریات کے باعث وسیع المشربی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ رام اور رحمٰن ایک نظر آنے لگے تھے، مسجد و مندر اور دیر و کلیسا میں کوئی فرق نہ رہا تھا، اور ع "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" پر عمل عام ہو گیا تھا نتیجۃً ملّتِ اسلامی کا جداگانہ تشخّص ہی شدید خطرات سے دوچار ہو گیا تھا۔

علمائے ظاہر یا "حاملانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین" کی جانب سے اس طرزِ عمل کی مخالفت ایک فطری امر تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ و خانقاہ کی باہمی چشمک رفتہ رفتہ بُغض اور عداوت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلامی ہند کی پُوری تاریخ رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کی باہمی کشمکش اور علماء اور صوفیاء کی باہمی آویزش کی مسلسل داستان ہے جس میں ایک 'بُعدِ رابع' (FOURTH DIMENSION) کا اضافہ ہو گیا۔ اوائلِ عہدِ مغلیہ میں ایران سے شیعیّت کی درآمد جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اور جس کے زیر اثر مشرکانہ عقائد و خیالات اور بدعات

درسومات کا ایک سیلاب ارضِ ہند پر آگیا!

مسلم انڈیا کا سُنہرا دَور بلا شبہ اُس کا صدرِ اوّل ہی تھا یعنی دَورِ خاندانِ غلاماں جس میں مُلوک، احبار، رہبان کی تثلیث اگرچہ اُصولاً تو موجود تھی تاہم ابھی اس میں نہ تنزّل و انحطاط کے آثار نمایاں ہوئے تھے نہ باہمی بُغض و عناد کے بلکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے نہ صرف یہ کہ باہمی توافق و تعاون موجود تھا بلکہ بعض مثالیں انتہائی حسین امتزاج کی بھی نظر آجاتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرا زوال اور پستی کے جانب قدم بڑھتے گئے اور نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا تثلیث کا گھناؤنا پن بڑھتا چلا گیا بلکہ اس کی جڑیں بھی مسلم سوسائٹی میں مزید گہری اترتی چلی گئیں! ——— تا آنکہ مغلِ اعظم شہنشاہِ اکبر کے زمانے میں یہ صورتِ حال اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گئی اور حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عین اُس وقت جبکہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشیدِ حکومت نصف النہار پر چمک رہا تھا اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی و کس مپرسی کی حالت طاری ہو گئی! یہاں تک کہ نام نہاد 'دینِ الٰہی' نے دینِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اُسے سرزمینِ ہند سے ملک بدر کر دینے کا بیڑا اٹھا لیا! یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق کہ جذر جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اسی کی کوکھ سے مدّ کے آثار جنم لیتے ہیں، ہندوستان میں اسلام کے زوال کی انتہا کا یہ دَور سرزمینِ پاک و ہند میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی تمہید بن گیا! بقول علّامہ اقبالؔ ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ جب مغلِ اعظم علیہ ما علیہ کے آفتابِ اقتدار نے ابتدائی موانع و مشکلات کی بدلیوں سے نکل کر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنا شروع ہی کیا[1] تھا اور ہندوستان میں اسلام کے انتہائی زوال و انحطاط کے دورِ سیاہ کا آغاز ہونے ہی والا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے تحت سرزمینِ ہند میں دو

[1] اکبر کی حکومت کو استحکام ۱۵۵۶ء میں پانی پت کی دوسری جنگ میں فتحیاب ہونے کے بعد ہی حاصل ہوا تھا۔

خورشید ہدایت بھی طلوع ہوئے : ایک مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (جن کی ولادت ۱۵۶۴ء میں ہوئی) اور دوسرے : حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ (جن کا سنِ ولادت ۱۵۵۱ء ہے!) جن کی مُصلحانہ و مجدّدانہ مساعی نے حالات کے دھارے کا رُخ اس حد تک موڑ کر رکھ دیا کہ تقریباً چار سو سال کے بعد اسلامی ہند کو غازی اورنگ زیب عالمگیرؒ کی ذات میں گویا غازی صلاح الدّین ایوبیؒ اور سلطان ناصرالدّین محمودؒ کے محاسن کا جامع حکمران نصیب ہوا اور اس طرح مسلم انڈیا کے اوّل و آخر کے مابین ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہوگئی!

ان میں سے مقدم الذکر یعنی شیخ مجدّد کی مساعی میں پُرجوش مجدّدانہ رنگ نمایاں تھا اور مؤخر الذکر یعنی شیخ محدّث کی کوششوں پر خاموش مُصلحانہ انداز غالب تھا۔ چنانچہ حالات کے رُخ کی فوری تبدیلی میں اصل دخل یقیناً حضرتِ مجدّد کی مساعی کو حاصل ہے جبکہ سرزمینِ ہند میں علمِ حدیث نبویؐ کا پودا لگانے کی جو خدمت حضرتِ محدّث نے سرانجام دی اس کے اثرات بہت دیرپا اور دُور رس ثابت ہوئے بیعت حضرت مجدّدؒ کی تجدیدی مساعی کا اصل رُخ تصحیحِ عقاید، ردِّ بدعات، التزامِ شرع اور اتّباعِ سنّت کی جانب تھا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے رائج الوقت علمی و نظری اور اخلاقی و عملی ہر نوع کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر بھرپور تنقید کی، چنانچہ تردیدِ شیعیت پر بھی نہ صرف یہ کہ ان کے مکاتیب میں بہت زور ہے بلکہ "ردِّ روافض" کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی انہوں نے تحریر فرمایا۔ اور اگرچہ ان کی ان اساسی کوششوں سے بھی 'طریقت' اور 'شریعت' کے بُعد کو کم کرنے اور اس بڑھتی ہوئی خلیج کے پاٹنے میں بہت مدد ملی تاہم اس میدان میں اُن کا اصل کارنامہ فلسفۂ 'وحدت الوجود' کے مقابلے میں نظریۂ 'وحدت الشہود' کی تدوین و ترویج ہے جس نے ان تمام مفاسد کا سدِّباب کر دیا جو تصوّف کی راہ سے حملہ آور ہو رہے تھے، نتیجۃً باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کی اہمیّت بھی دوبارہ مسلّم ہوئی، عشق و محبّت کے ساتھ ساتھ اطاعت و اتّباع کا جذبہ بھی از سرِ نو بیدار ہوا، فنا فی اللہ کے بجائے بقا باللہ کو مقصود و مطلوب کا درجہ

حاصل ہوا اور جذب و سکر اور مستی و بے خودی کے بجائے جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد نمایاں ہوئے ——— اور ان سب کا حاصل یہ کہ ہند میں ملّتِ اسلامی کا جداگانہ تشخّص از سرِ نو مستحکم ہو گیا۔ اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ کہیں سرزمینِ ہند میں جسے مذہبوں اور فلسفوں کے بہت بڑے عجائب گھر کی حیثیت حاصل ہے دینِ محمدیؐ بھی صرف ماضی کی ایک یادگار بن کر نہ رہ جائے بقول علّامہ اقبال مرحوم :-

حاضر ہوا میں شیخ مجدّدؒ کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلع انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں،
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

سلسلۂ نقشبندیہ، جس کا پودا سرزمینِ ہند میں حضرتِ مجدّدؒ کے مرشد خواجہ باقی باللہ کے ہاتھ سے لگا، اصلاً بھی جملہ سلاسلِ طریقت میں سے اقرب اِلَی الشّریعت ہے، اور حضرتِ مجدّدؒ کے ہاتھوں جو عظیم الشّان کارنامہ سرانجام پایا اس کی بنیاد بھی خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس میں جو شان حضرت مجدّدؒ نے پیدا کی وہ انہی کا حصّہ ہے اور یوں تو بعد میں سلسلۂ نقشبندیہ باقویہ بھی ہندوستان میں جاری رہا اور اس سے بہت سا خیر پھیلا لیکن "ہند میں سرمایۂ ملّت کی نگہبانی" کا فریضہ جس شان کے ساتھ حضرتِ مجدّدؒ کے اخفاد و خلفاء نے ادا کیا اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ یہی وہ واحد سلسلہ ہے جس کے منسلکین نے ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کے علاوہ کلمۂ حق کہنے کی پاداش اور ردِّ بدعت و رفض کے جُرم کی سزا کے طور پر حوالۂ زنداں ہونے اور جان پر کھیل جانے کی روایات کو بھی از سرِ نو تازہ کیا گویا ع " من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را!" (سرمدؒ)

بایں ہمہ، حضرتِ مجدّدؒ کے یہاں بھی حنفیّت میں غلوّ اُسی شدّت کے ساتھ موجود ہے جو مسلم انڈیا کی پوری تاریخ کا جزوِ لاینفکّ ہے۔ گویا حضرتِ مجدّدؒ کی مساعی سے اسلام ہند میں اس مقام تک تو پہنچ گیا جہاں سے (دورِ غلاماں میں) اِس کا آغاز ہُوا

تھا لیکن ع "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو!" کا عمل اس سے آگے نہ بڑھ سکا!

البتہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کی خدمات کو اس سمت میں ایک مزید قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ شیخ محدّثؒ کی شخصیت بعض پہلوؤں سے تو حضرتِ مجدّدؒ ہی کی شخصیت کا ظلّ معلوم ہوتی ہے لیکن بعض دوسرے اعتبارات سے اُن کی حیثیت تقریباً ایک ڈیڑھ صدی بعد طلوع ہونے والے آفتابِ رُشد و ہدایت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پیشرو یا مقدّمۃ الجیش کی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ صوفی بھی تھے اور خواجہ باقی باللہؒ ہی کے مرید بھی، لیکن اس کے باوجود کہ انھیں بھی وحدتُ الوجود سے بُعد تھا وہ اس کی تردید میں اس درجہ سرگرم نظر نہیں آتے' اسی طرح وہ حنفی بھی تھے لیکن متشدّد نہیں بلکہ فقۂ حنفی کا رشتہ حدیثِ رسولؐ کے ساتھ جوڑنے کی سعی اوّلاً انہی سے شروع ہوئی۔ ان دونوں پہلوؤں سے تو وہ شیخ مجدّدؒ اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کے بَین بَین نظر آتے ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ امام الہندؒ نے اسلام کا رشتہ اس کی 'اصلِ ثابت' یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش کا آغاز کیا اور شیخ محدّثؒ نے دین کا تعلق اُس 'اصلِ ثابت' کی 'فرعِ اوّل' کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی، اُن کی شخصیت حضرت امام الہندؒ کی شخصیت کا مقدّمہ یا دیباچہ نظر آتی ہے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ یہی حضرتِ محدّثؒ کی اصل خدمت (CONTRIBUTION) ہے۔ کہ انھوں نے علمِ حدیث کا پودا سرزمینِ ہند میں لگایا۔ اور حدیثِ رسولؐ کی باقاعدہ درس و تدریس کا بھی آغاز کیا اور اس سے متعلق تصنیف و تالیف کا بھی! چنانچہ خود انہوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا اور ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحقؒ نے صحیح بخاری کو فارسی میں منتقل کیا۔ مزید برآں انھوں نے مشکوٰۃ کی ایک مفصّل شرح (لمعات التّنقیح) عربی زبان میں اور اس سے بھی زیادہ طویل شرح (اَشِعّۃُ اللّمعات) فارسی میں تحریر کی، علاوہ ازیں اَسنادِ حدیث اور اسمائُ الرّجال پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور لمعات کے مقدّمے کے ذریعے بھی عُلومِ حدیث

کا ایک جامع تعارف کرا دیا!

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی مساعی کا تفصیلی جائزہ تو ظاہر ہے کہ ان مختصر شذرات کی حدود سے باہر ہے تاہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں ان کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دورِ جدید کے فاتح ہیں اور اس اعتبار سے خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ انہوں نے حضرتِ مجددؒ اور شیخ محدثؒ دونوں کی مساعی کو منطقی انتہا تک پہنچایا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ وہ دونوں اصلاً امام الہندؒ ہی کی شخصیت کی تمہید تھے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک طرف حضرتِ مجددؒ نے ہند میں اُمّتِ مسلمہ کو از سرِ نو ایک مستحکم داخلی تشخص عطا کیا تو شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر امّت کے خلاف اٹھنے والے سب سے بڑے خارجی طوفان کے مقابلے کا سامان کیا اور حضرتِ مجددؒ نے "ردِّ روافض" سے جس کام کا آغاز فرمایا تھا اس کی تکمیل شاہ صاحبؒ نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاءؓ" اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخینؓ" اور ان کے صاحبزادے شاہ عبد العزیزؒ نے "تحفۂ اثنا عشریہ" ایسی کتابوں کی تصنیف سے کی ——— اور دوسری طرف شیخ محدثؒ نے علمِ حدیث کا جو پودا سرزمینِ ہند میں لگایا تھا شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے نہ صرف یہ کہ اس کی آبیاری کی بلکہ اپنی انتھک کوششوں سے صنم خانۂ ہند کو علمِ حدیث نبوی کا ایک عظیم الشان چمن بنا دیا۔ عجیب مشابہت ہے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی اور ایک فارسی میں، اسی طرح امام الہندؒ نے مؤطا امام مالکؒ کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی (المسوّی) اور ایک فارسی میں لکھی (المصفّی) واضح رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک مؤطا امام مالکؒ کو علمِ حدیث کے ذیل میں اصلِ اوّل کی حیثیت حاصل ہے۔

ان پر مستزاد ہیں شاہ صاحبؒ کے وہ کارنامے جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام

کی نشاۃِ ثانیہ کے طویل عمل کا اصل نقطۂ آغاز ان ہی کی ذاتِ گرامی ہے :

مثلاً ایک یہ کہ علمِ فقہ کے میدان میں ایک طرف آپؒ نے "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" تصنیف فرمائی جس سے تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین اعتدال کی راہ واضح ہوئی اور دوسری طرف "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" ایسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی جس نے فقہی اختلافات کی اہمیت کو کم کرنے کے ضمن میں نہایت دور رس نتائج پیدا کیے۔

دوسرے یہ کہ اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کے ذریعے آپ نے حکمتِ دین کو ایک باقاعدہ علم کی حیثیت دے دی اور اسلام کے نظامِ عقائد، نظامِ عبادات، اور نظامِ معاشرت و معاملات کو ایک مربوط اور منضبط نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا۔ جس کی آنے والے دور میں شدید ترین ضرورت پیش آنے والی تھی ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصلِ ثابت یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا۔ چنانچہ ایک طرف قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے ذریعے قرآن کے مطالب و مفاہیم کو عوام تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اگرچہ اس پر انھیں شدید مخالفت حتیٰ کہ عوامی یورش تک کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کی تصنیف کے ذریعے علمِ تفسیر کو ایک چیستاں کے بجائے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے متعارف کرایا اور درمیانی استعداد تک کے حامل لوگوں کے لیے فہمِ قرآن کی راہیں آسان کر دیں۔

شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں میں سے دو یعنی شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کے بامحاورہ اور لفظی ترجمے کر کے گویا اپنے والدِ مرحوم کے شروع کیے ہوئے کام کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج برِ صغیر پاک و ہند میں علم و فہمِ قرآن کا جو غلغلہ اور ہمہمہ ہے وہ سب دہلی کے اسی عظیم خانوادے کی مساعی کا نتیجہ نہیں!

الغرض ویسے تو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا علمی اصلاح و تجدید کا پورا

کارنامہ ہی نہایت رفیع اور قابلِ قدر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی مساعی کو عالمِ اسلام میں یورپ کی پوری تحریکِ احیاء العلوم (RENAISSANCE) کا ہم پلّہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجّہات کو از سرِ نو قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا ——— اور اللہ کی رسّی کے ساتھ اُمّتِ مُسلمہ کے تعلّق کو دوبارہ اُستوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ " لَا یُصْلِحُ اٰخِرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا " اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی سعی و جُہد کی راہ کھول دی ——— ! فَجَزَاهُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ !!

'میثاق' کی اشاعت بابت نومبر ۱۹۷۵ء میں راقم الحروف کا ایک مقالہ 'عظمتِ صَومِ رمضان' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ جس میں راقم نے حدیثِ قدسی "اَلصَّوْمُ لِیْ وَ اَنَا اَجْزِیْ بِهٖ" کے بارے میں یہ عرض کیا تھا کہ اسے بعض لوگوں نے اِعراب کے ذرا سے فرق کے ساتھ یوں بھی پڑھا ہے کہ 'اَلصَّوْمُ لِیْ وَ اَنَا اُجْزٰی بِهٖ' (ترجمہ) روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود ہی اس کی جزا ہوں ....." ——— اس پر محترم مولانا شمس الحسن صاحب خطیب جامع مسجد خضراء صدر کراچی' نے اپنے مکتوبِ گرامی میں تحریر فرمائی کہ :

"حدیثِ قدسی کا دوسرا فقرہ 'وَ اَنَا اَجْزِیْ بِهٖ' ہے جس کو مضمون میں بصیغۂ مجہول 'وَ اَنَا اُجْزٰی بِهٖ' پڑھنے کی گنجائش بتائی گئی ہے جو غلط ہے۔ حضرت مولانا تھانویؒ نے اپنے مواعظ میں اس کی تغلیط کی ہے اور فرمایا ہے کہ وَ اَنَا اُجْزٰی بِهٖ کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ میں اُس کی جزا بن جاؤں گا بلکہ معنی یہ ہوں گے کہ مجھ کو اس کی جزا دی جائے گی یعنی اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ مجھ کو روزہ کی جزا دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی بالکل غلط ہیں اس لیے اس کو اُجْزٰی بِهٖ پڑھنا غلط ہے اگر ہم کہیں اَلْاَجِیْرُ یُجْزٰی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ مزدور کو مزدوری دی جائے گی اور یہ معنی نہیں ہوں گے کہ خود مزدور کو مزدوری میں کسی کے حوالہ کر دیا جائے

گا۔ قرآن میں بھی سورۂ نجم میں صیغۂ مجہول استعمال ہوا ہے :۔ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى یعنی پھر اس کو اس کی سعی و محنت کا پُورا پُورا صلہ دیا جائے گا۔ نہ یہ کہ وہ شخص خود جزاء بن جائے گا۔"

راقم اس گرفت پہ مولانا موصوف کا از حد ممنون ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا تھانویؒ کی رائے بہت وزنی اور مدلّل ہے۔ راقم نے اس حدیثِ قدسی کا یہ ترجمہ مولانا عبدالعزیز صاحب مرحوم خطیب جامع مسجد نُور، ساہیوال سے ایک خطبۂ جمعہ میں سُنا تھا اور اس پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

راقم کی تحریر" اسلام کی نشأۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام" کا انگریزی ترجمہ برادرم ڈاکٹر ابصار احمد سلمہٗ کے قلم سے مجلّہ "ISLAMIC EDUCATION" کے تازہ شمارے میں شائع ہوگیا ہے جو انجمن کے دفتر سے دو روپے کے عوض حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دوسری اور احسن صورت یہ ہے کہ بارہ ۱۲ روپے سالانہ چندہ دفتر آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس ۷، فرینڈز کالونی، ملتان روڈ لاہور کے پتے پر ارسال کرکے اس شمارے سے باقاعدہ خریداری کا آغاز کرلیا جائے۔

اسلام کی نشأۃ ثانیہ

کرنے کا اصل کام

از

اسرار احمد

حافظ احمد یار صاحب
اُستاذ شعبۂ اسلامیات جامعہ پنجاب

حفاظت متن قرآن

۳

(۱۷) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی وفات کے ساتھ سلسلۂ وحی بند ہو جانے کے باعث قرآنِ کریم کے متن میں کسی تبدیلی یا اضافہ کا امکان ختم ہو گیا۔ اب قرآن مکمّل ہو چکا تھا۔ اس کی اپنی آخری مکمّل اور متعیّن و مرتّب صورت میں "جمع فی الصّدور" (بذریعہ حفظ) کا کام بھی مکمّل ہو گیا۔ اس کی آخری آیت تک کے تحریر میں آجانے سے "جمع فی السّطور" (بذریعہ کتابت) کا کام بھی منتشر اوراق (موادِ کتابت) کی صورت میں تکمیل پذیر ہو چکا تھا۔ اب اسی "فی السّطور" (تحریری) مجموعے کو "فی الصّدور" (حفظ کردہ) مجموعے کے مطابق مُرتّب و مُدوّن کر لینے کا صحیح وقت آگیا تھا۔ اس سے پہلے یہ کام ممکن نہ تھا ـــــ اور اب اس میں تاخیر درست نہ تھی۔

(۱۸) ہم دیکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں حفاظتِ متنِ قرآن کے دو بنیادی اُصول طے پا گئے اور عملاً نافذ کر دیے گئے (ا) حفظ جس کے ذریعے تلفّظ (PRONUNCIATION) اور ترتیب کی حفاظت مقصود تھی اور (ب) کتابت ـــــ جس کے ذریعے ہجاء (SPELLING) اور رسم (ORTHOGRAPHY) سے استناد کو نصّ پر اعتماد کی بنیاد قرار دیا گیا۔ عہدِ نبویؐ کے بعد سے آج تک حفاظتِ متنِ قرآن کے لیے ان ہی دو اصولوں سے کام لیا گیا ہے۔ البتّہ مختلف زمانوں میں عصری ضروریات اور حالات کی بنا پر ان اصولوں کے عملی اطلاق میں وسعت اور افادیّت کو ملحوظ رکھا جاتا رہا ـــــ ان بنیادی اُصولوں کی روشنی میں عہدِ نبویؐ کے بعد سے عصرِ حاضر تک

حفاظتِ متنِ قرآن کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان کو ہم چار مراحل کے تحت بیان کر سکتے ہیں (۱) عہدِ صدّیقی (۲) عہدِ عثمانی (۳) اموی اور عباسی دَور (۴) طباعت اور صدا بندی کا دَور (یعنی عصرِ حاضر)۔

عہدِ صدّیقی ــــ ایک خطرے کے امکانِ بعید کا احساس اور اس کا قبل از وقت تدارُک

(۱۹) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے صحابہ کرامؓ کے اندر قرآنِ کریم کی عظمت اور اہمیّت کا جو احساس، اُس کے فہم و تدبّر کا جو شوق و ذوق اور اس کی تلاوت اور تعلیم کا جو بے پناہ شغف پیدا کر دیا تھا، اُس کا منطقی نتیجہ تھا کہ آنحضورؐ کی وفات کے ساتھ ہی بیک وقت متعدّد صحابہؓ کو "جمع و تدوینِ قرآن" کا خیال از خود پیدا ہوا۔ بعض ممتاز صحابہؓ نے (جو پورا قرآن حفظ بھی کر چکے تھے اور جن کے پاس مختلف منتشر مواد پر مکمّل قرآن تحریری طور پر بھی جمع ہو گیا تھا) ــــ اپنے طور پر اس اصل تحریری مواد کو یا حسبِ ضرورت اُس کی نقل کو (مثلاً پتھر کی تختی سے جھلّی یا کاغذ پر منتقل کر لینا تاکہ یکجا ترتیب دے کر رکھنا آسان ہو) اپنے حافظے کی مدد سے ترتیبِ تلاوت کے مطابق پورے قرآن کو یکجا مرتّب کتاب (مصحف) یا کم از کم فائل (صحف یا صحائف) کی صورت میں مدوّن کرنا شروع کر دیا۔ ایسے بزرگوں میں سے عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ خصوصاً قابلِ ذکر ہیں کیونکہ آگے چل کر خاص وجوہ کی بنا پر (جس کی تفصیل اسی مضمون میں بیان ہو گی) ان کے "نسخوں" کا ذکر حفاظتِ متنِ قرآن کی تاریخ کا ایک اہم موضوع بن گیا۔ ان کے علاوہ اس ضمن میں حضرت ابوموسٰی اشعری، حضرتِ عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرتِ عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُمّ سلمہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے نام بھی مشہور رہیں۔

(۲۰) ان بزرگوں کی "مساعیٔ تدوینِ قرآن" کی حیثیت انفرادی تھی۔ اور اُن کے کام میں انفرادی رُجحانات و ضروریات اور انفرادی معلومات کا عکس نمایاں تھا۔ بعض نے ذاتی استفادہ اور یادداشت کے لیے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے حاصل کردہ بعض

تفسیری اشارات بھی اپنے مصاحف میں لکھ لیے تھے۔ مثلاً حضرت علیؓ کے جمع کردہ نسخے کا ذکر جس طرح شیعہ سنّی روایات میں آتا ہے، اُس میں قدرِ مشترک یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ نسخہ غالباً "تدوینِ متنِ قرآن" سے زیادہ "تدوینِ تفسیرِ قرآن" کی سب سے پہلی کوشش تھی۔ اسی طرح بعض صحابہؓ کے مصاحف میں "سبعہ احرف" پر مبنی کچھ اختلافاتِ قراءات بھی تھے، جن کا اظہار بعض دفعہ تلفظ کے تنوّع اور بعض دفعہ رسم کے اختلاف کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ انفرادی عمل میں غلط فہمی یا سہو و نسیان کے امکانات بھی اسی نوعیت کے اجتماعی کام کی نسبت یقیناً زیادہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر یہ بھی منکشف ہوا کہ بعض نامی گرامی صحابہؓ کے ذاتی تیار کردہ نسخے اجتماعی اصلاح کے محتاج تھے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی کتاب کی حفاظت مقصود تھی۔ اس نے وفاتِ نبویؐ کے بعد ایک سال کے اندر پورے قرآنِ کریم کو مکتوب صورت میں یکجا مُدوّن اور مرتّب کرنے کی ایک اجتماعی کوشش کے اسباب و محرّکات بھی پیدا کر دیئے۔

(۲۱) یمامہ (نجد و بحرین کا درمیانی علاقہ) کے مسیلمہ کذّاب نے آنحضورؐ کی زندگی ہی میں (سنہ ۱۰ھ) نبوّت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ آنحضورؐ کی وفات (ربیع الاوّل ۱۱ھ) کے بعد ابوبکر صدّیقؓ نے مسیلمہ اور دیگر مرتدینِ عرب کی بغاوتوں کو کم و بیش دو سال کے اندر فرو کر لیا۔ مسیلمہ کے ساتھ مسلمانوں کی شدید جنگ ـــــ جسے جنگِ یمامہ کہا جاتا ہے ـــــ ربیع الاوّل ۱۲ھ میں ہوئی۔ اس جنگ میں مسیلمہ مارا گیا، مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ تاہم اُن کے جانی نقصانات اتنے زیادہ (ایک ہزار سے زائد) تھے کہ عہدِ نبویؐ سے آج تک جتنی جنگیں لڑی گئیں۔ ان میں اس کی نظیر کم ملتی تھی۔ شہدائے یمامہ میں بہت سے لوگ پورے قرآن کے حافظ تھے (قراء) تھے۔ جن میں سب سے مشہور سالم بن معقل تھے (مولی ابی حذیفہ) تھے اور جزوی حُفّاظ کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ تھی۔ ہر چند کہ جنگِ یمامہ کے بعد بھی زندہ موجود صحابہؓ میں ایسے بزرگ قُرّاء کی تعداد ـــــ جو حفظ و کتابت قرآنِ کریم کے لحاظ سے درجہ اوّل میں شمار ہوتے تھے ـــــ یمامہ کے شہید قُرّاء کے مقابلے پر کہیں زیادہ تھی اور یمامہ

کی جنگ سے حفاظتِ متنِ قرآن کو کوئی فوری اور شدید خطرہ لاحق نہیں ہو گیا تھا۔ تاہم مسلمان اس وقت سخت ہنگامی حالات اور شدید خطرات سے دوچار تھے۔ یمامہ سے کہیں بڑی جنگوں کے امکانات موجود تھے۔ پھر مسلمانوں کے اندر دین کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا جو جذبہ اس وقت موجود تھا۔ (بقول حضرتِ عمرؓ وہ میدانِ جنگ میں پروانہ وار گرتے تھے) ـــــ اس کے نتیجے میں قُرّاء کی اکثریت کے معدوم ہو جانے کے امکانات کو مطلقاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت تک قُرّاء (مکمّل حافظوں) کی تعداد بہرحال معدود تھی۔ قرآنِ کریم کے آخری حصّوں کے نُزول کو چند ہفتے یا چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ عرب کے کونے کونے میں مکمّل حُفّاظ موجود نہ تھے۔ اتنی جلدی ایسا ہونا ممکن بھی نہ تھا۔ ایسے (مکمّل) حُفّاظ کی زیادہ تعداد مدینہ منوّرہ ہی میں تھی۔ اور مدینہ کو مرتدّین کے ہاتھوں خطرہ میں پا کر یہ لوگ جاں بکف ہو کر میدان میں نکل آئے تھے۔ اس کے ساتھ اگر یہ بات بھی پیشِ نظر رکھی جائے کہ قرآنِ کریم کی ترتیبِ تلاوت بڑی حد تک ابھی صرف حافظے کے ذریعے متعیّن اور محفوظ تھی۔ کتابت یا تحریر ابھی تک نصِّ قرآنی (متن) کی ترتیب سے زیادہ اس کی حفاظت اور اشاعت کے لیے استعمال کی جاتی رہی تھی۔ شروع سے بنیادی اہمیّت حفظ و استظہار کو دی گئی تھی نہ کہ مصاحف و کتابت کو۔ اگرچہ مؤخّر الذّکر کو نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے حُفّاظ کی اکثریّت کے معدوم ہو جانے کے امکان کے ساتھ متنِ قرآن کے ضیاع کا امکان نہ سہی متن کی ترتیب کے ضیاع کا امکان ضرور وابستہ قرار دیا جا سکتا تھا ـــــ یہی تھا وہ دُور اندیشانہ اندازِ فکر جس کی بنا پر واقعۂ یمامہ کے بعد حضرتِ عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ صدّیق کو "جمعِ متنِ قرآن" کا کام کر ڈالنے کا مشورہ دیا۔ حضرتِ عمرؓ کی سکیم کا مقصد ایک تو مُدوّن متن کی ایسی حفاظت کا بندوبست کرنا تھا، جس کی طرف بوقتِ ضرورت رجوع کیا جا سکے۔ دوسرے قرآنِ کریم کی آخری اور مکمّل شکل کی توثیق "بذریعہ حافظہ" کے ساتھ ساتھ "بذریعہ کتابت" بھی مطلوب تھی۔

(۲۲) حضرتِ ابوبکرؓ پہلے تو متردّد ہوئے جس کی بڑی وجہ تو "خوفِ بدعت"

تھا۔ لیکن غالباً اس تردّد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں "کتابتِ قرآن" پر انحصار "حفظِ قرآن" کے بارے میں تساہُل اور تغافُل کا باعث نہ بن جائے ..... عربوں کے نزدیک تحریری یادداشت حافظے کی کمزوری کی علامت بھی تھی اور سبب بھی ـــــ بہرحال جب ابوبکر صدیقؓ پر حضرت عمرؓ کے مشورے کی افادیّت واضح ہوگئی تو انہوں نے اس کام کے لیے حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کو منتخب کیا۔ ابوبکرؓ صدیق خود حافظِ قرآن تھے اور وہ خود بھی یہ کام کر سکتے تھے مگر ایک شدید بحرانی دَور کے رئیسِ مملکت ہونے کی حیثیّت سے آپ درآں حالات اس کام پر پُوری توجّہ نہیں دے سکتے تھے اور یہ کام جزوقتی نہیں بلکہ ایک ہمہ وقتی انچارج کے کرنے کا تھا۔

(۲۳) زید بن ثابتؓ کا انتخاب اُن کی اس کام کے لیے کئی لحاظ سے مُسلّمہ اہلیّت کی بنا پر کیا گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر اُمُور کا ذکر خود حضرت ابوبکرؓ صدّیق نے زیدؓ کے تقرّر کے وقت کر دیا تھا۔ اس کے لیے حضرت زیدؓ کے حسبِ ذیل خصائص کو ذہن میں رکھنا چاہیئے :- (۱) وہ نوجوان تھے۔ اس وقت اُن کی عمر ۲۲ سال تھی۔ پُورے قرآنِ کریم کی کتابت یوں بھی کچھ کم محنت طلب نہیں ہے۔ لیکن متفرّق تحریری مواد کو متعدّد حُفّاظ کی مدد سے ایک مقرّرہ طریقِ کار اور شرائط (جن کا ذکر ابھی آگے آتا ہے) کے ساتھ مدوّن کر کے لکھنا احتیاط کے علاوہ بڑی محنت اور کاوش کا کام تھا۔ اور ایسے کام کے لیے "نوجوان" ہونا بڑی موزوں اور بنیادی ضروری صفت تھی۔ خود حضرت زیدؓ نے اس کام کو پہاڑ اُٹھانے سے زیادہ سخت قرار دیا تھا۔ اور اس کی وجہ متقیانہ ورع و احتیاط کے علاوہ وہ ذہنی و جسمانی مشقّت اور وقت و آرام کی قربانی بھی تھی، جو اس کام میں درکار[۱] تھی۔ اس کے ساتھ یہ بات

[۱] عجیب بات ہے کہ بعض حضرات کو حضرت زیدؓ کے "رجلٌ شابٌّ" (بالفاظِ ابی بکرؓ صدیق) ہونے میں اور اُن کو سونپے گئے کام میں کوئی مناسبت ہی نظر نہیں آئی۔ کیا یہ کام محنت طلب نہ تھا؟ کیا واقعی محنت اور طاقت میں کوئی تعلّق اور مناسبت نہیں ہے؟

بھی پیشِ نظر رہے کہ حضرتِ زیدؓ نے یہ عظیم کام ایک سال کے عرصے میں ـــــ جنگِ یمامہ اور وفاتِ ابی بکرؓ صدّیقؓ کے درمیان ـــــ سرانجام دیا تھا۔

(ب) وہ ذہین اور عقل مند تھے۔ اُن کی عربی کتابت میں مہارت کے سب معاصرین معترف[۲۷] تھے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حکم پر انہوں نے دو تین ہفتوں میں عبرانی زبان کا لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ عبداللہ بن عباسؓ اپنی ساری علمی و خاندانی عظمت کے باوجود اُن کے مکان پر بعض مسائل پوچھنے جایا کرتے تھے۔ (ج) وہ امانت اور استقامت میں شک و شبہ سے بالاتر تھے۔ علمی فضیلت اس پر مُستزاد تھی۔ حضرتِ عمرؓ نے اُنہیں تین دفعہ مدینہ میں اپنا قائم مقام بنایا۔ حضرت عثمانؓ جب بھی حج پر جاتے اُنہیں مدینہ میں قائم مقام بنا کر جاتے تھے حضرت زیدؓ کی اس صفت دیانت و تقویٰ کے ذکر (بالفاظِ ابی بکر صدّیقؓ "لا نتھمک") سے دیگر کبار صحابہؓ کی دیانت مشکوک نہیں ہو جاتی (بعض کو یہ بھی سوجھی ہے)۔ ـــــ بات صرف اتنی ہے کہ اس کام کے لیے جسمانی قوّت برداشت اور ذہانت کے ساتھ دیانت اور استقامت بھی درکار تھی۔ دیگر بہت سے بزرگ بھی ان صفات میں حضرتِ زیدؓ کے برابر یا ممکن ہے کسی درجے میں اُن سے بڑھ کر ہوں۔ تاہم حضرت زیدؓ میں یہ ہر سہ بنیادی صفات ضرور موجود تھیں۔ (د) حضرتِ زیدؓ کاتبِ وحی بھی رہ چکے تھے۔ قرآنِ کریم کے بعض حصّے انہیں سب سے پہلے آنحضورؐ کے سامنے خود تحریر کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حضورؐ کے زمانے میں مختلف موادِ کتابت (رقاع۔ چھوٹے ٹکڑوں) سے قرآنی آیات کے نسبتاً بڑے مجموعے بھی تیار کیا کرتے تھے۔ یہ اُن صحابہؓ کرام میں سے ایک تھے جنہوں نے آنحضورؐ کی زندگی میں متفرّق مواد پر مکمّل قرآن تحریری صورت میں بھی اور بذریعہ حفظ بھی جمع کر لیا تھا۔

(ہ) حضرت زید کی سب سے بڑی اور بے مثل خصوصیّت یہ تھی کہ وہ "عرضۂ اخیرہ"

---

[۲۷] تیرہ سو سال سے ان کے قواعدِ املاء اور طرزِ ہجا کی بعینہٖ نقل متنِ قرآن کی صحّت کا معیار چلا آ رہا ہے۔ ان کی اس کتابت کا ذکر آگے عہدِ عثمانی میں آئے گا۔

(دیکھئے اسی مضمون کا پہلا حصہ 'میثاق' ستمبر، اکتوبر ۷۵ء صفحہ ۵)
میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شامل رہے تھے۔ اِس خصوصیت میں وہ واقعی تمام صحابہؓ میں ممتاز تھے اور اس کام کے لیے یہ امتیاز کچھ کم اہم نہیں تھا[1]

(۲۴) اِن تمام صفات، اہلیت اور خصوصیات کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع قرآن کے لیے حضرت زیدؓ کو ایک مقررہ طریق کار کا پابند کر دیا تھا۔ ازاں جملہ ضروری اُمور یہ تھے کہ :-

(ا) ترتیبِ متن کے تعین کے لیے حُفّاظ سے مدد لی جائے اس سلسلے میں حضرت ابی ابن کعبؓ (جو خود بھی عہدِ نبویؐ کے حُفّاظ میں سے تھے) خاص طور پر حضرت زیدؓ کی مدد کے لیے مقرر ہوئے تھے۔

(ب) ضروری تھا کہ متنِ قرآن صرف حافظے کے ذریعے نہیں بلکہ تحریر سے متعین کیا جائے اور ہر تحریر پر اس بات کی گواہی لی جائے کہ یہ آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں۔ اس شرط کو پُورا کرنے کے لیے حضرت زیدؓ کو مسجدِ نبویؐ میں آنے والے تمام لوگوں سے مدد لینا ضروری تھا۔ اور فی الواقع انہوں نے ایسا کیا۔ بلکہ لوگوں کے گھروں میں بھی جانا پڑا اور بعض دفعہ مدینہ منوّرہ سے کئی دن کے فاصلے پر موجود صحابہؓ سے بھی رابطہ قائم کرنا پڑا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں لکھے گئے صحائف سے کام لینے نیز اپنی ذاتی تحریروں اور حافظے سے مدد لینے کے باوجود حضرت زیدؓ ابنِ ثابت کا متعدد صحابہؓ سے مدد لینا اِس لیے بھی ضروری تھا کہ متنِ قرآن کو تواتر کی بنا پر متعین و مرتب کیا

---

[1] حضرت زیدؓ بن ثابت کے حالات میں یہ اُمور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی ولادت مدینہ میں ہوئی لیکن اُن کی پرورش (چھ سال کی عمر میں والد کی وفات کے بعد) مکّہ میں ہوئی۔ یہ مکّہ ہی میں اسلام قبول کر چکے تھے۔ ہجرت کے وقت گیارہ سال کے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ عرصہ پہلے یا بعد مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ آگئے تھے۔ جنگِ یمامہ میں انہیں بھی تیر لگا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے کچھ اور کام لینا تھا، بچ گئے۔ کتبِ احادیث میں اُن سے ۱۹۲ احادیث مروی ہیں۔ وفات ۴۵ھ میں ہوئی۔

جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر بعض علماء نے حضرت زیدؓ کی ان کوششوں اور اس طریق کار سے یہ نتیجہ اخذ کیا (اور اس کی تائید حضرت زیدؓ کے اختیار کردہ مخصوص رسم الخط سے بھی ہوتی ہے) کہ زیدؓ کے جمع کردہ نسخۂ قرآن (بعہدِ صدّیقی) میں سبعہ احرف کا لحاظ بھی رکھا گیا تھا۔ کیونکہ انہیں متنوّع قراءات کے بارے میں نقلِ صحیح (گو غیر متواتر ہی ہو) کے حاصل ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ اگرچہ یہ بات واضح ہے کہ یہ نسخہ نقطہ اور شکل (حرکات) سے عاری تھا۔

(۲۵) قریب ایک سال کے عرصے میں یہ نسخہ مکمّل ہوا۔ اس نسخۂ قرآن کو سب سے پہلے "مصحف" کا نام دیا گیا اور آئندہ یہی اصطلاح "مکمّل قرآن" کے لیے استعمال ہونے لگی۔ اسی بنا پر آگے چل کر دوسرے صحابہؓ کے انفرادی جمع کردہ نسخہ ہائے قرآن بھی اُن کے مصاحف کہلانے لگے۔ یہ "مصحفِ صدّیقی" پورے کا پورا کاغذ پر یا کسی ایک مواد پر نہیں لکھا گیا تھا۔ کاغذ کے علاوہ جھلّی اور کچھ دیگر مواد کتابت بھی استعمال کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک حجاز میں کاغذ یا باریک جھلّی بھی عام دستیاب نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ "مُصحفِ صدّیقی" یکجا "مجلّد" کتاب کی صورت میں نہ تھا بلکہ مختلف مواد کے چھوٹے چھوٹے مرتّب مجموعے بنا دیئے گئے تھے اور اس طرح یہ مجموعے یا صحائف مل کر مکمّل مصحف بنتا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی کتاب کا مکمّل مُسوّدہ کسی فائل میں مرتّب و مکمّل شکل میں موجود ہو مگر اس کی شیرازہ بندی یا جلد بندی نہ کی گئی ہو ـــــ اِس "مصحف" میں قرآن اور صرف متنِ قرآن ہی درج کرنے کا اس قدر اہتمام کیا گیا تھا کہ اُس میں اسمائے سُوَر بھی درج نہیں کئے گئے تھے۔ اور اسی چیز نے پہلے دن سے اس نسخے کو ـــــ دیگر صحابہؓ کے انفرادی مصاحف کے مقابلے پر ـــــ زیادہ صحیح اور خاص اہتمام والے نسخے کی حیثیّت دے دی تھی ـــــ اور یہ خاص اہتمام بھی کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک اجتماعی کوشش کا نتیجہ تھا۔

(۲۶) اس طرح آنحضرت صلّی اللہُ علیہ وسلّم کی وفات سے دو سال کے اندر پورا قرآن مکمّل و مرتّب کتاب کی صورت میں بذریعہ تحریر بھی مدوّن ہو گیا ـــــ بلکہ

حقیقت یہ ہے کہ یہ دو سال بھی اس خاص اہتمام والے نسخے کو مکمّل کرنے میں لگے کیونکہ یہ نسخہ کسی خاص ہنگامی حالت میں مراجعت و استعمال کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ورنہ یہ پہلا مکمّل نسخۂ قرآن نہیں تھا۔ اِسی دَوران بلکہ اس سے پہلے کئی صحابہؓ نے اپنے انفرادی مصاحف مکمّل کر لیے تھے۔ اور انہی مصاحف کے ذریعے آگے قرآنِ کریم کے پڑھنے پڑھانے کا کام جاری تھا اور جاری رہا۔ اپنے ذاتی مصاحف کو مکمّل کرنے میں بعض صحابہؓ و صحابیاتؓ نے اِس "مصحفِ صدّیقی" سے مدد ضرور لی تھی لیکن تمام مصاحف کی اصل یہی اور صرف یہی نسخہ نہیں تھا۔ حضرتِ عمرؓ نے اپنے زمانے میں صحابہؓ کے مشورے اور اجماع سے رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کے باجماعت قیام اور اس میں پُورا قرآن پڑھے جانے کا رواج ڈالا۔ اس کے باوجود پورے عہدِ فاروقی میں متنِ قرآن کے بارے میں کسی اختلاف کا ذکر تک نہیں ملتا۔ سبعہ احرف کا اختلاف موجود تھا، لیکن اُس کی حقیقت سے آگاہ ہونے کے باعث کبار صحابہؓ نے اس اختلاف پر کوئی جھگڑا تو درکنار کسی تعجب کا اظہار بھی کم کیا۔ اس زمانے تک "مصحفِ صدّیقی" کو ایک مہتمّ بالشان نسخے کی حیثیّت تو حاصل تھی مگر اس اہتمام کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ عہدِ عثمانی میں ہوا جب عجمیوں کے اختلاط اور بعض دیگر اسباب کی بناء پر سبعہ احرف کا استعمال ایک فتنہ بننے لگا۔ اس وقت اس نسخے (مصحفِ صدّیقی) کو ہی اصل بنا کر نیا ایڈیشن تیار کیا گیا۔ اس کا ذکر ابھی آگے آ رہا ہے۔

مصحفِ صدّیقی کی تیاری حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے کارناموں میں سے ایک نمایاں کارنامہ اور تاریخ حفاظتِ متنِ قرآن کے مراحل میں سے ایک اَہم مرحلہ ہے جس کے متعلّق بعض مسیحی مُستشرقین نے اس حسرت کا اظہار کیا ہے کہ کاش مسیح (علیہ السّلام) کے فوراً بعد ان کے تلامذہ اور پیروکاروں میں سے بھی کسی کو ان کی تعلیمات کو بصورتِ کتاب مُرتّب و مُدوّن کرنے کی سُوجھتی۔ تاریخی طور پر یہ نسخہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے بعد حضرتِ عُمرؓ کے پاس اور اُن کے بعد حضرت حفصہؓ کے پاس رہا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس نسخے کی اہمیت اور اس کی تیاری میں

توضیح متضاد اور غلط ہے اور [illegible] جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ (بخاری)

مولانا امین احسن اصلاحی

اسلامی ریاست میں
فقہی اختلافات کا حل

فقہی معاملات میں اسلامی حکومت کا اصلی مزاج

اگرچہ ہمارے ملک کے مختلف فقہی مذاہب کے پیرو اسلامی نظام کے مطالبہ پر متفق ہیں، ان میں سے کسی نے بھی، خواہ وہ اس ملک کے اندر کتنی ہی اقلیت میں کیوں نہ ہو، فرضی اندیشوں کی بنا پر اس کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ فقہی گروہوں کے سوا بعض عقائدی اختلاف رکھنے والے فرقوں نے بھی، اس مطالبہ میں سواد اعظم کا ساتھ دیا ہے تاہم اس بات کا اندیشہ موجود ہے کہ اسلامی نظام کے مخالفین اپنی ریشہ دوانیوں سے ان میں سے بعض کو بدگمان کرنے کی کوشش کریں۔ اس وجہ سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فقہی معاملات میں ٹھیک صحیح اسلامی حکومت کا جو مزاج ہوتا ہے اس کو واضح کر دیا جائے تاکہ ناواقفیت کسی کے لیے بدگمانی کا سبب نہ بن سکے۔ نیز اگر کوئی گروہ کسی غلط توقع کی بنا پر اس کی تائید کر رہا ہو تو وہ اپنی اس غلط فہمی کو وقت سے پہلے ہی رفع کر سکے۔

فقہی معاملات سے متعلق ایک صحیح اسلامی حکومت کا رویہ معین کرنے کے لیے دو بنیادی باتوں کا سامنے رکھنا ضروری ہے:۔

۱۔ ایک یہ کہ ایک اسلامی ریاست ایمان کی تمام جزئیات اور عقائد و اعمال کی تمام تفصیلات سے تعرض نہیں کیا کرتی۔ اس کا تعلق صرف اسلام یعنی ان ظاہری اعمال و عقائد تک محدود ہوتا ہے جو اجتماعی و معاشرتی اور سیاسی زندگی سے لگاؤ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی عقیدہ یعنی توحید و رسالت کا اقرار کرنا، مسلمانوں کے طریقہ پر نماز ادا کرنا، اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرتے رہنا، نکاح و طلاق اور کھانے پینے میں اسلام کے ٹھہرائے ہوئے ضابطہ حلال و حرام کی پابندی

کرنا معاشرت و معیشت میں اپنے رویہ کو اسلامی حدود کے اندر رکھنا، بس ریاست کا براہ راست تعلق اسی طرح کے امور سے ہے۔ اگر ایک شخص ان چیزوں میں اسلامی طریقوں کا پابند ہے تو ایک اسلامی حکومت اس سے اس امر پر کوئی باز پرس نہیں کرے گی کہ وہ فقہی مسائل میں امام مالکؒ یا امام احمدؒ کا پیرو کیوں ہے، امام ابو حنیفہؒ یا امام شافعیؒ کا پیرو کیوں نہیں ہے؟ یا عقائد میں معتزلہ کا ہمنوا کیوں ہے، اشعری یا ماتریدی کیوں نہیں ہے؟ یا خانقاہی رجحانات کیوں رکھتا ہے، نہایت کٹر قسم کا ظاہری اور اہل حدیث کیوں نہیں ہے؟ اس طرح کے امور سے نہ براہ راست ریاست کا تعلق ہوتا ہے نہ ان امور سے اسلام نے ریاست کو تعرض کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ باتیں افراد کے اپنے فیصلہ کرنے کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ریاست کا فرض صرف اس قدر ہے کہ افراد کی آزادیٔ رائے اور آزادیٔ انتخاب کی حفاظت کرے، کسی کو اس آزادی پر دست درازی کرنے کا کوئی موقع نہ دے۔ اگر حکومت کسی غلط رجحان کی اصلاح کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس کے لیے تعلیمی و تبلیغی ذرائع استعمال کر سکتی ہے، قانون کی طاقت نہیں استعمال کر سکتی۔ تاکہ لوگ جو تبدیلی قبول کریں وہ اپنی آزادیٔ رائے کے ساتھ قبول کریں نہ کہ جبر و زور کی وجہ سے۔ حکومت کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کے اندر قانون اور طاقت کے ذریعہ سے کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے جائز حدود سے تجاوز کرنے کی مجرم ہوگی اور افراد کی اس شہری آزادی پر حملہ کرے گی جس کی حفاظت کے لیے خدا اور رسول کے نام پر اس نے ذمہ لے لیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمان حکومتوں نے افراد کی اس بنیادی آزادی کو بسا اوقات سلب کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے سبب سے بے شمار مسلمانوں کے جان و مال مظالم کا شکار ہوئے ہیں۔ بہت سے ائمۂ کرام کو بھی نشانۂ ستم بنایا گیا ہے اور حکومتوں کے مراکز اور بادشاہوں کے دربار مختلف گروہوں کی سازشوں کے اڈے بنے رہے ہیں لیکن یہ ساری باتیں اس بات کے سبب سے نہیں تھیں کہ اسلام نے حکومت کو لوگوں کے اعمال و عقائد کی جزئیات

میں دخل دینے کا حق دیا ہے۔ بلکہ یہ مستبد حکمرانوں کی اپنی زیادتیاں تھیں کہ انہوں نے فقہ و کلام میں جو مسلک خود اختیار کیا اسی مسلک کو تمام خلق پر بالجبر مسلّط کر دینا چاہا۔ ایک صحیح اسلامی حکومت جو خلافت راشدہ کے نمونے پر قائم ہو اس کے لیے اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ کلام و فقہ کے کسی مسلک کو لوگوں کے ذہنوں پر بالجبر ٹھونسنے کی مجاز نہیں ہے۔

۲۔ دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ ایک صحیح اسلامی ریاست کسی متعیّن امام کی تقلید اور کسی متعیّن فقہ کی پیروی کے اصول پر قائم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ لازم ہے کہ اس کی بنیاد براہ راست کتاب و سُنّت اور اجتہاد و شُوریٰ پر ہو۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری فقہ اسلامی بلا کسی استثناء و امتیاز کے اس کا سرمایہ ہو اور وہ تمام اجتہادی امور میں کسی تخصیص و ترجیح کے بغیر، مختلف ائمہ کے اجتہادات پر نگاہ ڈال کر اپنے قانون کے لیے ان اقوال اور رایوں کو انتخاب کرے جو اس کی نظر میں کتاب و سنت اور روح اسلام سے قریب تر نظر آئیں۔ جن امور سے متعلق اس کو پچھلے ائمہ کے اجتہادات میں کوئی بات نہ ملے کتاب و سُنّت کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر وہ خود ان کا حل معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ پچھلے ائمہ کے جو اقوال انتخاب کیے جائیں گے ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی ہو سکیں گی۔ یہ عین ممکن ہے کہ آج سابق ائمہ میں سے کسی کے کسی قول کو قانون کی حیثیت دے دی جائے لیکن کل دلائل کی قوّت واضح ہونے کے بعد اس کی جگہ کسی اور کے قول کو اختیار کر لیا جائے۔ ہمارے مختلف فقہی گروہوں میں سے ہر گروہ کا مسلک و مذہب حکومت کی نگاہوں میں یکساں عزت و احترام کا مستحق ہو گا اور ہر گروہ کے لوگوں کو اس بات کا پورا پورا موقع حاصل رہے گا کہ وہ اپنے اپنے مسلک و مذہب کے دلائل اور اس کی خوبیاں برابر پیش کرتے رہیں تاکہ ہمارے ائمہ کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کے اندر جس قدر جواہر موجود ہیں وہ برابر نکھر نکھر کر سامنے آتے رہیں اور قانون کی تدوین کرنے والوں کو ان کے انتخاب میں آسانی ہو۔

اس طریقہ پر حکومت اپنے عمل کے لیے جو قانون بنالے گی ملک کا نظام اسی قانون کے

مطابق چلے گا۔ عدالتیں اسی قانون کے مطابق مقدمات کے فیصلے کریں گی اور ہر شہری کو ان فیصلوں کی بے چون وچرا تعمیل کرنی پڑے گی۔ لیکن ایک شخصی رائے کی حیثیت سے ایک شخص کوئی ایسا مسلک اختیار کر سکے گا جو حکومت کے اختیار کردہ مسلک سے الگ ہو۔ اور وہ اپنے اس مسلک کی حمایت میں زبان اور قلم کی قوت بھی استعمال کر سکے گا۔ وہ حکومت کے احکام و قوانین کی اطاعت کرتے ہوئے اس بات کا حق رکھے گا کہ وہ جس مسلک کو زیادہ قوی اور زیادہ مدلل سمجھتا ہے ایک رائے کی حیثیت سے اس کو پیش کرے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ایسے کتنے مسائل پیش آتے تھے جن میں امیر اور شوریٰ کے فیصلوں سے بہت سے لوگوں کو اختلاف ہوتا۔ اگرچہ اختلاف کرنے والے اطاعت بہرصورت امیر کے فیصلوں ہی کی کرتے لیکن وہ رائے کی حد تک بدستور اپنے مسلک پر قائم رہتے اور علانیہ اپنی رائے کی پبلک میں تائید و حمایت کرتے۔ اس کی ایک عمدہ مثال منیٰ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نماز قصر نہ کرنے کا واقعہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے اس مسلک سے پوری شدت کے ساتھ اختلاف کیا لیکن جب نماز کا وقت آیا تو انہوں نے بحیثیت امیر کے نماز حضرت عثمانؓ ہی کی اقتدا میں انہی کے مسلک کے مطابق ادا کی۔ اِس مسئلہ میں لوگوں کو حضرت عثمانؓ سے جو اختلاف تھا وہ اُن کے زمانہ میں بھی باقی رہا اور آج بھی باقی ہے

یہ اسی پابندئ نظام اور آزادئ رائے کی برکت ہے کہ خلافت راشدہ کے دور میں ملک کا نظام بھی پورے استحکام کے ساتھ قائم رہا اور فکر و اجتہاد کے لیے وہ سارا مواد بھی اسی زمانہ میں فراہم ہو گیا جس سے بعد میں اسلامی فقہ کی مختلف عمارتیں تیار ہوئیں۔ ایک صحیح اسلامی حکومت کے مزاج کا اصلی تقاضا یہی ہوتا ہے کہ لوگ تقلید کی بندشوں سے آزاد ہو کر فکر و اجتہاد سے کام لیں۔ لیکن کوئی گروہ اگر اس کی خواہش کے خلاف تقلید کی بندشوں ہی میں جکڑا ہوا رہنا پسند کرتا ہے تو حکومت اس کی اس خواہش میں بھی خلل انداز ہونا پسند نہیں کرتی بشرطیکہ وہ گروہ خود حکومت سے یہ مطالبہ نہ کرے کہ وہ بھی اسی کی طرح فکر و اجتہاد سے استعفا دے کر اپنے پاؤں میں تقلید کی

بیڑیاں ڈال لے۔ عامۃ الناس کا کوئی گروہ تقلید کی بندشوں میں بندھا ہوا رہ کر بھی زندگی کے مقررہ دن کسی نہ کسی طرح پورے کر سکتا ہے لیکن ایک حکومت، اور وہ بھی ایک اسلامی حکومت، تقلید کی جکڑ بند کے اندر دو دن بھی اپنی ہستی اپنے اصولوں کے مطابق باقی نہیں رکھ سکتی۔

ماضی میں جو حکومتیں کسی متعیّن فقہ کی تقلید کے اصول پر قائم ہوئیں یا آج جو اس اصول پر قائم ہیں یہ صحیح اسلامی حکومت کا نمونہ نہیں ہیں۔ کسی متعیّن فقہ کو نہ تو کتاب وسنت کا بدل قرار دیا جا سکتا اور نہ فقہ کے مختلف ائمہ میں سے کسی امام کو رسول اللہ کا درجہ دیا جا سکتا۔ اس لیے اس طرح کی حکومتوں کو اسلامی حکومت کہنا اسلامی نظریۂ سلطنت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اسلامی سلطنت کے لیے یہ بنیادی شرط ہے کہ اس کی اساس براہِ راست کتاب وسنت اور اجتہاد وشوریٰ پر ہو۔ یہ حکومتیں اس کے بالکل برعکس یا تو اس اصول پر قائم ہوئیں کہ جو فقہی مذہب حکمران کا ہوا، اس نے اسی مذہب کو سارے ملک پر لاد دینا چاہا یا ملک کے باشندوں کی اکثریت جس فقہی مذہب کی پابند تھی اسی کو پورے ملک کا مذہب بنا دیا گیا۔ یہ دونوں باتیں اسلامی نظریۂ سلطنت کے خلاف ہیں۔ اس مسئلہ پر ہم نے اس کتاب کے باب "شہریّت اور اس کے حقوق" میں مفصل بحث کی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک اسلامی حکومت اوّل تو ان جزوی باتوں سے کوئی تعرّض ہی نہیں کرتی جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہوتا ہے۔ وہ اپنا براہ راست تعلق صرف انہی امور سے رکھتی ہے جو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے تعلّق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ثانیاً وہ ان امور میں بھی معاملات کو کسی خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے براہ راست کتاب وسنت کے ان اصولوں سے رہنمائی حاصل کرتی ہے جن پر تمام مسلمانوں کو اتفاق ہے۔ اس طرح ایک اسلامی ریاست کا ہر شہری اس بات میں بالکل آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی زندگی کے دائرہ میں جس فقہی وکلامی مسلک کو ترجیح دیتا ہے اس کو اختیار کرے بشرطیکہ اصل دین کے اندر اس کے لیے گنجائش وجود ہو۔ رہے اجتماعی مسائل تو ان کے بارہ میں اظہار رائے کی آزادی ہر شخص کو حاصل رہتی ہے البتہ جب حکومت کسی ایک پہلو کو اختیار کر لیتی ہے تو اطاعت ہر شخص کو اسی

کی کرنی پڑتی ہے اور اس طرح آزادیٔ رائے کے باوجود کسی اختلاف یا کسی فتنہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

ریاست میں مسلمان فرقوں کی حیثیت

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا تعلق ان گروہوں سے تھا جو اصولِ دین، عقائد اسلام اور ماخذ شریعت کے بارے میں بالکل متفق ہیں۔ جن کے اندر صرف وہ معمولی اختلافات ہیں جو تاویل کے اختلاف یا کسی اصولِ اجتہاد کے اختلاف سے پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ اب ہم ان مسلمان فرقوں کے سوال پر غور کریں گے جو مسلمانوں کے اندر شامل سمجھے جاتے ہیں یا شامل ہونے کے مدعی ہیں لیکن مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے وہ بعض عقائد میں بھی اختلاف رکھتے ہیں اور شریعت کے بعض ماخذ کے بارے میں بھی عام مسلمانوں سے کچھ مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

ان فرقوں کے مسئلہ کا حل اسلام میں یہ ہے کہ اسلام نے اسلامی ریاست کی شہریت کے لیے جو شرطیں قرار دی ہیں ان پر ان کو جانچا جائے۔ جو ان شرطوں پر پورے اتریں یا جو ان کو قبول کر لیں ان کو اسلامی ریاست کا پورا شہری قرار دیا جائے اور ان کے لیے وہ تمام حقوق تسلیم کیے جائیں جو اسلام نے اسلامی ریاست کے شہریوں کو بخشے ہیں۔ رہے وہ فرقے جو ان شرائط پر پورے نہیں اترتے یا وہ ان شرطوں کو منظور کرنے پر آمادہ نہیں ہیں تو ان کو ایک اقلیت قرار دے کر ان کے حقوق ایک اقلیت کی حیثیت سے محفوظ کر دیئے جائیں۔ اسلامی ریاست میں شہریت کے شرائط اور اس کے حقوق پر مفصّل بحث ہم نے اس کتاب کے ایک مستقل باب میں کی ہے۔ البتہ یہاں مسئلہ کی وضاحت کے لیے ہم مذکورہ باب سے وہ اصول پیش کیے دیتے ہیں جن پر اسلامی ریاست میں شہریت کے حقوق کا حاصل ہونا مبنی ہے۔ وہ اصول یہ ہیں:

۱۔ آدمی اللہ کی توحید کا اقرار کرے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر اور آخری سند تسلیم کرے۔

۳۔ اسلامی طریقہ پر نماز پڑھے۔ عام مسلمانوں سے اپنی نماز الگ نہ کرے۔

۴۔ اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرے۔

۵۔ اسلام کے مقرر کیے ہوئے قبلہ کو اپنا قبلہ قرار دے۔

۶۔ نکاح، طلاق اور حلال و حرام کے بارہ میں اسلامی شریعت کے ضابطوں کی پابندی کرے۔

۷۔ ریاست کا خیر خواہ اور وفادار رہے۔

جو فرقے ان شرطوں کو پورا کر رہے ہوں یا پورا کرنے کا اقرار کریں وہ اسلامی ریاست کے شہری ہیں۔ ان کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فهو المسلم له ما للمسلم وعليه ما على المسلم (بخاری) وہ مسلم ہیں ان کو مسلمانوں کے حقوق حاصل ہوں گے اور ان پر مسلمانوں کی سی ذمہ داریاں ہوں گی۔ ان کے ساتھ اسلامی ریاست کا معاملہ ان کے ظاہری رویّہ کے مطابق ہوگا۔ حکومت کو ان کے عقائد کے بارے میں خواہ مخواہ کی کھوج کرید کا حق نہیں ہوگا، باطن کا محاسبہ ریاست کے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ اس وجہ سے جب تک کسی فرقہ کے بارے میں اس بات کی قطعی شہادت موجود نہ ہو کہ اس نے مذکورہ شرائط میں سے کسی شرط سے انحراف کیا ہے محض اٹکل پچو اندازوں کی بنا پر اس کے حق شہریت پر دست درازی کرنا جائز نہیں ہے۔

کسی فرقہ کو اسلامی ریاست میں شہریت کے حقوق دینے اور مسلمانوں کے ساتھ اس کو شامل رکھنے میں جس حد تک اس کے ساتھ رعایت کی جا سکتی ہے اس کے لیے ہم خوارج کی مثال پیش کرتے ہیں جن کا تعلق خلافت راشدہ کے زمانہ سے ہے۔ اس مثال سے اندازہ ہو سکے گا کہ تاویل کی غلطی اور متکلمانہ طرز کے غلو سے جو گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں ایک صحیح اسلامی ریاست ایک بہت بڑی حد تک ان کو انگیز کرتی ہے اور ان کی بنا پر کسی فرقہ کو مسلمانوں سے کاٹنا پسند نہیں کرتی۔

خوارج کا فتنہ[1] حضرت علیؓ کے زمانہ میں ظہور میں آیا۔ مختصراً ان کا واقعہ یوں ہے کہ آٹھ

---

[1] خوارج کا ذکر حقوق شہریت کے باب میں بھی ہوا ہے۔ اس کو بھی پیش نظر رکھیے

دس ہزار آدمیوں کی ایک جماعت ان کے لشکر سے اس بنیاد پر کٹ کر علیحدہ ہوگئی کہ انھوں نے خلافت کے قضیہ میں ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ کی پنچایت کو کیوں منظور کیا؟ ان کا نعرہ یہ تھا کہ "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" اللہ کے سوا کسی کو فیصلہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور اسکی تاویل وہ یہ کرتے تھے کہ اللہ اور قرآن کا فیصلہ براہِ راست نافذ ہونا چاہیے، اس کے لیے کسی واسطہ کو اختیار کرنا شرک و کفر ہے۔ پھر آگے بڑھ کر وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ چونکہ علیؓ اور معاویہؓ دونوں نے پنچایت کو منظور کرکے (نعوذ باللہ) شرک و کفر کا ارتکاب کیا ہے اِس وجہ سے وہ دونوں اور اُن کے تمام ساتھی کافر ہیں۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر ایک ردّہ اس پر انھوں نے یہ جمایا کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوتا ہے اور اس کے لیے دائمی عذابِ جہنّم ہے اور چونکہ علیؓ اور معاویہؓ نے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے اِس وجہ سے اُن کے لیے بھی (العیاذ باللہ) دائمی عذابِ جہنّم ہے۔

تاویل کی غلطی اور پھر متکلّمانہ طرز کے غلو نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ ایک طرف تمام صحابہؓ و تابعین پر کفر اور دائمی عذابِ جہنّم کا فتویٰ جڑ دیا گیا اور دوسری طرف اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کی آڑ لے کر کسی سیاسی ادارہ کی ضرورت ہی سے سرے سے انکار کر دیا گیا جس کے دوسرے الفاظ میں معنی یہ ہوئے کہ نہ صرف ابوموسیٰ اشعریؓ اور عمرو بن العاصؓ کی پنچایت ناجائز اور حرام ہے بلکہ خلافت کا پورا نظام بھی سراسر کفر و معصیت ہے۔ اپنے اس نقطۂ نظر کے لحاظ سے خوارج ٹھیک ٹھیک نراج (ANARCHY) کے علمبردار تھے اور عقاید کے سلسلہ میں انھوں نے جو بدعت و ضلالت ایجاد کی اس میں تو آج تک وہ منفرد ہی ہیں۔

لیکن خوارج کی اس ضلالت کے باوجود معلوم ہے کہ حضرت علیؓ نے اُن کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ پہلے تو انھوں نے افہام و تفہیم کے ذریعہ سے اُن کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی اور اس کوشش سے ایک حد تک فائدہ بھی ہوا۔ خوارج کی ایک جماعت راہِ راست پر آگئی لیکن اس کے بعد بھی جب ایک جماعت بدستور اپنی ضلالت ہی پر جمی رہی اور وہ کسی

طرح سدھرتی نظر نہیں آئی تو حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھجوایا کہ جب تک تم اپنے اس عقیدہ کی آڑلے کر بدامنی اور خونریزی برپا کرنے کی کوشش نہیں کروگے اس وقت تک ہم تم سے تعرّض نہیں کریں گے لیکن اگر تم نے انتشار اور بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کی تو ہم تمہاری سرکوبی کرنے پر مجبور ہوں گے نیل الاوطار میں ہے :-

فارسل الیھم کونوا حیث	حضرت علی نے ان کو پیغام بھجوایا کہ تم کو آزادی حاصل ہے
شئتم وبیننا وبینکم الا	کہ جہاں چاہو رہو، البتہ ہمارے اور تمہارے درمیان
تفسکوا دما ولا تقتطعوا سبیلا	یہ قرارداد ہے کہ ناجائز طور پہ کسی کا خون نہیں بہاؤ گے
ولا تظلموا احدا فان فعلتم	گے۔ بدامنی نہیں پیدا کروگے اور کسی پر ظلم نہیں ڈھاؤگے اگر ان باتوں
نبذت الیکم الحرب	میں سے کوئی بات تم سے سرزد ہوئی تو پھر میں تمہارے خلاف جنگ کا حکم دے دوں گا۔

دوسری جگہ حضرت علی کے یہ الفاظ منقول ہیں :-

لا نبدءکم بقتال مالم	اگر تم نے کوئی بدامنی برپا نہیں کی تو ہم تم سے لڑنے میں پہل
تحدثوا فسادًا	نہیں کریں گے ۔

حضرت علیؓ نے ان سے جو وعدہ فرمایا تھا اس کو آخر وقت تک نبھایا اور ان کی گمراہیوں اور ان کے مفسدانہ نظریات کے باوجود ان کی آزادی اور ان کے حقوق میں اس وقت تک کوئی مداخلت نہیں کی جب تک انہوں نے ملک کے نظم ونسق کو درہم برہم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ جب ان کو یہ پتہ چلا کہ وہ جتھہ بندی کر کے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہے ہیں تو مجبورًا ان کو ان کی سرکوبی کے لیے اقدام کرنا پڑا۔ نیل الاوطار ج ۷ ص۱۳۳ میں ان کی جتھہ بندی اور فساد انگیزی کا بیان اس طرح ہوا ہے :-

— اور یہ لوگ ہر طرف سے نکل نکل کر مدائن میں اکٹھے ہونے شروع ہوئے حضرت علیؓ نے مراسلت کر کے ان کو اس عقیدہ سے باز آنے کی دعوت دی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ جب تک علیؓ پنچایت پر راضی ہونے کے سبب سے اپنے کفر کا اقرار اور اس سے توبہ نہ کریں گے اس وقت تک ہم اپنے نقطہ نظر پہ جمے رہیں گے۔ حضرت علیؓ نے پھر مراسلت کی لیکن وہ بھی لاحاصل رہی۔ پھر

انہوں نے کھلم کھلا نا یا دتیاں شروع کر دیں۔ چنانچہ جن مسلمانوں کا ادھر سے گزر ہوتا ان کو قتل کر دیتے یہاں تک حضرت علیؓ نے عبداللہ بن خباب کو کسی علاقہ کا حاکم بنا کے بھیجا۔ ان لوگوں نے ان کو پالیا اور قتل کر ڈالا۔ ان کے ساتھ ان کی لونڈی تھی جو حاملہ تھی، اس کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکال لیا۔ حضرت علیؓ کو ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے مجبوراً ان پہ فوج کشی کی"

خوارج کی اس ضلالت اور ان کے باغیانہ اور نراجی نظریات کے باوجود حضرت علیؓ کی حکومت نے ان کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا اس نے ہمارے فقہا اور ائمہ کے سامنے یہ سوال پیدا کر دیا کہ اگر کوئی فرقہ ایسا ہو جو نظریہ و عقیدہ کے حد تک اس بات کا قائل ہو کہ حکومت کے خلاف بغاوت کرنا جائز ہے لیکن عملاً نہ تو اس نے کوئی جنگ شروع کی ہو اور نہ اس کے لیے کوئی تیاری ہی کر رہا ہو تو اسلامی حکومت اس کے قتل کرنے کی مجاز ہے یا نہیں؟

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ چند احادیث نقل کرنے کے بعد مذکورہ بالا سوال کا مندرجہ ذیل جواب دیتے ہیں اور ملاحظہ فرمایئے کہ کس قدر عمدہ جواب دیتے ہیں اور نبی صلعم کے ایک ارشاد سے کتنا نفیس اور کتنا نازک استدلال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

وفی احادیث الباب دلیل علی مشروعیۃ الکف عن قتل من یعتقد الخروج علی الامام مالم ینصب لذالک حربا و یستعد لہا لقولہ صلعم "فاذا خرجوا فاقتلوھم"	اور اس باب میں جو حدیثیں نقل ہوئی ہیں ان کے اندر اس بات کی دلیل موجود ہے کہ شریعت ان لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتی جو امام کے خلاف بغاوت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے اس عقیدہ کو عملی شکل دینے کے لیے کوئی جنگ نہ برپا کریں یا اس کے لیے کوئی تیاری نہ شروع کر دیں کیونکہ نبی صلعم کا ارشاد ہے کہ فاذا خرجوا فاقتلوھم جب وہ بغاوت کریں تب ان کو قتل کر دو۔
(نیل الاوطار۔ ج ۷ صہ ۱۴۱)	

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

وان قوما لو اظہروا رای الخوارج	اگر کوئی قوم اس طرح کی رائے کا اظہار کرے جس طرح کی رائے خوارج

لم یحل تتلھم بذالك وانما یحل اذا کثروا وامتنعوا بالسلاح و استعرضوا الناس	رکھتے تھے تو اس کی بنا پر ان کا قتل جائز نہیں ہوگا۔ ان کا قتل صرف اس صورت میں جائز ہوگا جب ان کی تعداد زیادہ ہوجائے اور منظم ہونے لگ جائیں اور لوگوں کے جان و مال سے تعرّض کرنا شروع کردیں۔

(نیل الاوطار ج ۷، ص ۱۳۶)

امام خطابی اس بات پر علماء کا اجماع نقل کرتے ہیں کہ خوارج اپنی ضلالت کے باوجود اپنے شہری حقوق کے اعتبار سے مسلمانوں کے اندر شمار ہوں گے۔ اور وہ مسلمانوں میں سے ایک فرقہ ہیں۔

وقال الخطابی اجمع علماء المسلمین علی ان الخوارج مع ضلالتھم فرقة من فرق المسلمین واجازوا مناکحتھم واکل ذبائحھم وانھم لا یکفرون ماداموا متمسکین باصل الاسلام۔	خطابی کا قول یہ ہے کہ اس بات پر مسلمانوں کے علماء کا اجماع ہے کہ خوارج اپنی ضلالت کے باوجود مسلمانوں کا ایک فرقہ شمار ہوں گے اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کی اور ان کا ذبیحہ کھانے کی اجازت ہے اور یہ کہ جب تک وہ اسلام کے اصولوں پر قائم ہیں اس وقت تک ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

(نیل الاوطار ج ۷ ص ۱۴۱)

ابن بطال فرماتے ہیں کہ:۔

ذھب جمھور العلماء الی ان الخوارج غیر خارجین من جملة المسلمین	جمہور علماء کی یہ رائے ہے کہ خوارج مسلمانوں کے زمرہ سے خارج نہیں ہیں۔

(نیل الاوطار ج ۷ ص ۱۴۱)

خوارج کی اس مثال کو سامنے رکھ کر موجودہ مسلمانوں فرقوں کے متعلق بآسانی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کون کون سے فرقے ایسے ہیں جن کے لیے اسلامی نظام کے اندر گنجائش نکل سکتی ہے اور کون سے فرقے ایسے ہیں جو ان کے اندر صرف ایک اقلیّت ہی کی حیثیّت سے سما سکتے ہیں ان کو مسلمانوں کے برابر حقوقِ شہریّت نہیں دیئے جاسکتے۔

اسرار احمد

حج اور عید الاضحیٰ
اور ان کی اصل روح
قرآن حکیم کے آئینے میں

(اس سال ادارۂ پاکستان ٹائمز، لاہور کی جانب سے عید الاضحیٰ کے موقع پر ایک مضمون کا شدت سے اصرار ہوا تو بالکل غیر متوقع طور پر ایک تحریر

"THE HEJJ AND THE EID-UL-AZHA;
THEIR REAL SIGNIFICANCE AND SPIRIT."

کے عنوان سے حوالۂ قلم ہوگئی جو ۱۴ر دسمبر ۷۵ء کو عین عید الاضحیٰ کے روز شائع ہوئی۔ بعد میں خیال آیا کہ اس کا ترجمہ قارئینِ 'میثاق' کی خدمت میں بھی پیش کر دیا جائے۔ لیکن جب ترجمے کا آغاز کیا تو اس قاعدۂ کلیہ کے تحت کہ مصنف اپنی تحریر کا ترجمہ نہیں کر سکتا۔ اس میں اضافہ لازماً ہو جاتا ہے، تحریر ہٰذا میں بھی بہت سے اضافے ہوگئے۔

اسرار احمد)

اسلام کے پانچ ارکان میں سے اوّلین اور اہم ترین تو بلاشبہ کلمۂ شہادت ہے جو ایمان کے قانونی پہلو یعنی " اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ " کا مظہر ہے، بقیہ چار عبادت کی مختلف صورتوں پر مشتمل ہیں یعنی 'اِقَامَۃُ الصَّلٰوۃ' یا فرض نمازوں کی پابندی — 'اِیتَاءُ الزَّکٰوۃ'، یا صدقاتِ واجبہ کی ادائیگی۔ 'صَوْمُ رَمَضَانَ' یا ماہِ رمضان مبارک کے روزے اور 'حَجُّ الْبَیْتِ' یا بیت اللہ شریف کا حج!

ان کے مابین ایک دلچسپ تقسیم تو اس اعتبار سے ہے کہ اُن میں سے دو ہر مسلمان پر لازم ہیں خواہ وہ امیر ہو خواہ غریب یعنی صلوٰۃ و صوم اور دو صرف کھاتے پیتے مسلمانوں پر فرض ہیں یعنی زکوٰۃ صرف صاحبِ نصاب پر اور حج صرف صاحبِ استطاعت پر ـــــــ لیکن ایک دوسری اور نمایاں تر تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے دو یعنی صلوٰۃ و زکوٰۃ بقیہ دو کے مقابلے میں قدرے اوّلیت و اقدمیّت کے حامل بھی نظر آتے ہیں اور عظمت و اہمیت کے بھی - اس لیے بھی کہ قرآن مجید میں ان کا ذکر حد درجہ تکرار و اصرار کے ساتھ آیا ہے جبکہ حج کا ذکر کُل تین بار آیا ہے اور صوم کا صرف ایک بار اور اس لیے بھی کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا تذکرہ مکّی دَور کے آغاز ہی سے شروع ہو جاتا ہے جبکہ صوم و حج کا ذکر صرف مدنی سورتوں میں ملتا ہے - مزید برآں بعض ان روایات میں بھی جن میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جنگ کے خاتمے کی کم از کم شرائط کا بیان ہے ، شہادتین کے ساتھ صرف صلوٰۃ و زکوٰۃ ہی کا ذکر ملتا ہے ، صوم و حج کا نہیں مثلاً حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو طویل روایت احمد، بزار، نسائی ابن ماجہ وغیرہم نے نقل کی ہے اس میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظِ مبارکہ ملتے ہیں کہ :

" اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ	مجھے حکم ہُوا ہے کہ جنگ جاری رکھوں یہاں
النَّاسَ حَتّٰی یُقِیْمُوا	تک کہ لوگ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا
الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَ	کریں اور گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی
یَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ	معبود نہیں ہے - وہ تنہا ہے اور اس
اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا	کے ساتھ کوئی شریک نہیں
شَرِیْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا	ہے اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے
عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ	بھی ہیں اور رسول بھی - جب وہ یہ
فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَقَدْ	شرطیں پوری کر دیں تو وہ محفوظ ہو گئے
اِعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا	اور انھوں نے اپنی جانیں اور

دِمَآءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ — مال بچا لیے اِلاّ آنکہ کوئی قانونی
اِلاَّ بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ — حق واقع ہوجائے۔ رہا ان کے (خلوص
عَلَى اللهِ عَزَّ وَجَلَّ [1] — یا عدمِ خلوص) کا حساب تو وہ اللہ کے ذمّے ہے!

ایسے محسوس ہوتا ہے کہ شان و شوکت اور عظمت و اہمیت کی اسی ظاہری کمی کی تلافی کے لیے اسلام میں دونوں سالانہ تہواروں کو ان دو ارکانِ اسلام کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے ؛ یعنی عیدالفطر رمضان المبارک کے مُتصلاً بعد اور عیدالاضحیٰ حج بیتُ اللہ کے ساتھ !

عیدالاضحیٰ بلاشبہ حجّ ہی کی توسیع کی حیثیّت رکھتی ہے اس لیے کہ حجّ اس اعتبار سے ایک طرح کی محدودیّت کا حامل ہے کہ اس کے تمام مراسم و مناسک ایک متعین علاقے یعنی مکّہ مکرّمہ اور اس کے نواح ہی میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے اُس کے ایک رُکن یعنی اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی کو وسعت دے دی گئی ہے تاکہ اس میں روئے زمین پر بسنے والا ہر مسلمان شریک ہوجائے اور یہی عیدالاضحیٰ کی اصل حکمت ہے !

سب جانتے ہیں کہ حجّ اور عیدالاضحیٰ دونوں حضرت ابراہیم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی شخصیّت ہی کے گرد گھومتے ہیں جن کی تعظیم و تکریم روئے زمین کے بسنے والوں کی دو تہائی تعداد کرتی ہے اور ان دونوں کے مراسم و مناسک ان کی حیاتِ طیّبہ کے بعض واقعات کی یادگار ہی کی حیثیّت رکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے طویل سفرِ حیات کا خُلاصہ اور لُبّ لُباب اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہے : امتحان و آزمائش جس کے لیے قرآنِ حکیم کی اپنی جامع اصطلاح "اِبْتِلَاء" ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ میں اُن کی پُوری داستانِ حیات کو ان چند الفاظ میں سمو دیا گیا :

وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرٰهِيْمَ — اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو اُس کے

---

[1] یاد ہوگا کہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ان ہی الفاظ سے استدلال کیا تھا حضرت ابوبکر صدیق، رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کے معاملے میں !

رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ — ربّ نے بہت سی باتوں میں تو اُس نے
فَاَتَمَّهُنَّ (البقرۃ: ۱۲۴) — اُن سب کو پورا کر دکھایا!

واضح رہے کہ قرآنِ حکیم میں انسان کی حیاتِ دُنیوی کی اصل غرض و غایت ہی ابتلاء و آزمائش بیان کی گئی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی :

۱۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک : ۲) — وہ جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو کہ تمھیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سب سے اچھا عمل کے اعتبار سے!

۲۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا (الدھر: ۲) — ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جلے نطفے سے آزمانے کو، لہٰذا بنایا ہم نے اسے سُننے والا، دیکھنے والا۔

بقولِ علامہ اقبالؒ ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب — اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اور انسان کی فلاح و کامیابی کا دار و مدار اِس پر ہے کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی اور پروردگارِ حقیقی کی معرفت حاصل کرے اور اس کی محبّت سے سرشار ہو جائے۔ جو گویا امتحان ہے اس کی عقل و خرد کا اور آزمائش ہے اُس کے قلبِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ کی ——— اور پھر پورے عزم و استقلال اور صبر و ثبات کے ساتھ قائم و مستقیم رہے اس کی اطاعتِ کُلّی اور فرمانبرداریٔ کامل پر[1] جو گویا امتحان ہے اس کے عزم اور حوصلے کا اور آزمائش ہے اس کی سیرت کی پختگی اور کردار کی مضبوطی کی!

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو بھی سب سے پہلے اسی عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ کے

---

[1] یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۱ میں حضرت ابراہیم کے کل کارنامۂ حیات کا خلاصہ بیان کیا گیا۔ لفظِ 'اسلام' کے ذریعے جس کے معنیٰ ہی حوالگیٔ کامل اور سپردگیٔ کُلّی کے ہیں :

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ — جب جب کہا اس کے رب نے اس سے
قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ — "حکم مان!" فوراً کہا اُس نے "مَیں نے

امتحان سے سابقہ پیش آیا۔ انہوں نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جس میں ہر طرف کفر اور شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے اور کہیں بتوں اور مورتیوں کی پوجا ہو رہی تھی تو کہیں ستاروں اور سیاروں کو پوجا جا رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مطلق العنان بادشاہ بھی خدائی حقوق (DIVINE RIGHTS) اور کلی اختیارات کے دعووں کے ساتھ کوسِ لِمَنِ المُلک بجا رہا تھا۔ گویا شرکِ اعتقادی اور شرکِ عملی دونوں کے دل بادل ظُلُمٰتٌ م بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ کی شان کے ساتھ چھائے ہوئے تھے اور توحید کی کوئی کرن کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اس ماحول میں آنکھ کھولنے اور پرورش پانے والے نوجوان نے جب یہ نعرہ لگایا کہ :

اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ	مَیں نے تو اپنا رُخ پھیر دیا ہے اُس ذات
فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ	کی طرف جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور
حَنِیۡفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ؕ	زمین کو، ہر طرف سے یکسو ہو کر، اور مَیں
(الانعام : ۷۹)	ہرگز اُس کے ساتھ شرک کرنے والا نہیں !

تو کیا آسمان اور زمین وجد میں نہ آ گئے ہوں گے، اور کون و مکان میں ہلچل نہ مچ گئی ہو گی' بقول علامہ اقبالؒ ؎

عُروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں ۔۔۔ کہ یہ ٹوٹا ہُوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

اور کیا "لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫" کی اس شہادتِ عظمیٰ پر ملاءِ اعلیٰ کی بزم "لامکاں" میں "میرِ محفل"[1] نے ایک بار پھر فتحمندانہ انداز میں نہ کہا ہو گا کہ "اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ !"

اسی کو تعبیر فرمایا گیا سورۂ صٰفّٰت میں ان الفاظ میں کہ :

اِذۡ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ؕ	جب آیا وہ[2] (ابراہیمؑ) اپنے رب کے
(الصّٰٓفّٰت : ۸۴)	پاس ایک قلبِ سلیم کے ساتھ ۔

---

[1] خدا خود میرِ محفل بود اندر لامکاں خسروؔ ۔۔۔ محمدؐ شمعِ محفل بود، شب جائے کہ من بودم!

[2] کیا یہ صوفیاء کی اصطلاح "سیر الی اللہ" کا قرآنی ماخذ نہیں ہے ؟

عقل و فطرت کی اس آزمائش اور معرفتِ رب کے اس امتحان میں کامیابی کے فوراً بعد شروع ہو گیا 'استقامت' کی جانچ پرکھ کا ایک طویل اور جان گسل سلسلہ جس میں ہر لحظہ امتحان تھا، ہر آن ابتلاء۔ ایک جانب ایک نوجوان تھا اور دوسری جانب پوری سوسائٹی اور پورا نظام۔ گویا "کشاکشِ خس و دریا" کا دیدنی نظارہ! عزم و ہمت کا وہ کونسا امتحان تھا جو اسے پیش نہ آیا، صبر و ثبات کی وہ کونسی آزمائش تھی جس سے وہ دوچار نہ ہوا، حوصلہ تحمل و برداشت اور جذبۂ ایثار و قربانی کی جانچ پرکھ کا وہ کونسا طریقہ تھا جو اس پر آزمایا نہ گیا۔ گھر سے وہ نکالا گیا، معبد میں اس پر دست درازی ہوئی، سرِ عام اس پر ہجوم کیا گیا، دربار میں اس کی پیشی ہوئی اور آگ میں وہ ڈالا گیا ——— بقول شاعر ؎

اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے سو گذری — تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر — گرجے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار

لیکن نہ کبھی اس کے جوش اور ولولے میں کوئی کمی پیدا ہوئی نہ پائے ثبات میں کوئی لغزش! باپ سے "وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا" کی غیظ آمیز جھڑکی کھا کر بھی وہ پورے ادب و احترام اور پورے حلم و وقار کے ساتھ یہ کہتا ہوا رخصت ہوا:

سَلَامٌ عَلَيْكَ ۚ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ۝ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي ۖ عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ۝ (مریم: ۴۷ - ۴۸)

تم پر سلامتی ہو! میں اپنے پروردگار سے تمہارے لیے معافی کی درخواست کروں گا۔ حقیقتاً وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے اور میں علانیہ برأت کرتا ہوں تم سب سے بھی اور ان سے بھی جنھیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو اور میں تو پکاروں صرف اپنے پروردگار ہی کو ——— مجھے یقین ہے کہ میں اُس کو پکار کر بے نصیب نہ رہوں گا!

دربار میں پیشی ہوئی تو ؎

نہ لاؤ شو اس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے — سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی!

کے مصداق خدائے واحد و قہّار کے پرستار نے دنیوی شان و شوکت، جاہ و جلال اور دبدبے اور طنطنے کو ذرّہ بھر بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے شہنشاہِ وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعلان کیا :

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ — میرا رب وہ ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا

(البقرۃ : ۲۵۸) — ہے !

اور جب ربوبیّت و اُلوہیت کے مدّعیِ مغرور نے مناظرانہ رنگ میں کہا :

اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ — مجھے بھی زندہ رکھنے یا مار دینے کا اختیار

حاصل ہے !

تو پوری جراَتِ رندانہ اور شانِ بے باکانہ کے ساتھ تُرکی بہ تُرکی جواب دیا :

فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ — تو اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے

الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ — تجھ میں کچھ اُلوہیت ہے تو اُسے مغرب

الْمَغْرِبِ (البقرۃ : ۲۵۸) — سے طلوع کرکے دکھا !

نتیجۃً اُس کافرِ مردود مسمّیٰ نمرود کے پلّے سوائے مرعوبی و مبہوتی کے اور کچھ نہ رہا۔

اور پھر جب پوری قوم، پوری سوسائٹی، اور پورے نظامِ باطل نے اپنی شکست پر جھنجلا کر اُسے آگ کے ایک بڑے آلاؤ میں ڈالنے اور جلا کر راکھ کر دینے کا فیصلہ کیا تب بھی اس کے عزم اور ارادے میں کوئی تزلزل نہ آیا اور عشق کی اس بلند پروازی پر وہ عقل بھی انگشت بدنداں رہ گئی جس نے ابتداءً اسے خود ہی اس راہ پہ ڈالا تھا ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی!

اور جب خدائے علیم و قدیر نے اسے آگ سے معجزانہ طور پر زندہ و سلامت نکال لیا تو اس نے یہ کہتے ہوئے کہ :

اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ — مَیں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا

سَیَھْدِیْنِ ○ (الصّٰفّٰت : ۹۹) — ہوں۔ یقیناً وہ مجھے راہ یاب کرے گا !

گھر بار اور ملک و وطن سب کو خیر باد کہا اور آباء و اجداد کی سرزمین کو بحسرت و یاس

دیکھتا ہوا وہ اَن دیکھی منزل کی جانب روانہ ہوگیا تاکہ صرف خدائے واحد کی پرستش کر سکے اور محض اسی کے نام کا کلمہ پڑھ سکے! حالانکہ اب زندگی کے اس دَور کا آغاز ہو چکا تھا جس میں جوانی کا زور ٹوٹتا سا محسوس ہونے لگتا ہے اور کہولت کے آثار شروع ہو جاتے ہیں! بقولِ حالی ؎

ضعفِ پیری بڑھ گیا، جوشِ جوانی گھٹ گیا ❊ اب عصا بنوائیے نخلِ تمنّا کاٹ کر!

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ہجرت کے بعد کی پُوری زندگی مسلسل مسافرت و مہاجرت کی داستان ہے۔ آج شام میں ہیں تو کل مصر میں، پرسوں شرقِ اُردن میں ہیں تو اگلے روز حجاز میں، کوئی فکر ہے تو صرف اِس کی اور دُھن ہے تو محض یہ کہ توحید کا کلمہ سربلند ہو اور دعوتِ توحید کے لیے جا بجا مراکز قائم ہو جائیں۔ اپنی ان کوششوں میں وہ اُس بوڑھے باغبان سے نہایت گہری مشابہت رکھتے ہیں جو جا بجا اپنے لیے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے باغ لگاتا پھر رہا ہو۔

جب بڑھاپے کے آثار کچھ زیادہ ہی طاری ہوتے محسوس ہوئے اور اِدھر یہ نظر آیا کہ اولاد سے تا حال محرومی ہے تو فکر دامنگیر ہوئی کہ میرے بعد اس مشن کو کون سنبھالے گا۔ وطن سے ایک بھتیجے نے ان کے ساتھ ہی ہجرت کی تھی جسے شرقِ اُردن میں دعوتِ توحید کی علمبرداری سونپ دی تھی۔ اللہ سے دعا کی "رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝" (الصّٰفّٰت: ۱۰۰) "پروردگار نیک وارث عطا فرما!" اور اللہ کی شان کہ خالص معجزانہ طور پر ستاسی برس کی عمر میں اللہ نے ایک جیتا جاگتا بیٹا عطا فرما دیا! اور وہ بھی ایسا جسے خود اللہ نے "غلامٌ حلیم" قرار دیا!۔

جیسے جیسے بیٹا بڑا ہوتا گیا گویا بوڑھے باپ کا نخلِ تمنّا دوبارہ ہرا ہوتا گیا، یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ کیسی جذباتی وابستگی بوڑھے باپ کو اس بیٹے سے ہو گی اور کیسی اُمّیدیں اس نے اپنے دل میں اس کے ساتھ وابستہ کر لی ہوں گی، بیٹا برابر کا ہونے کو آیا تو گویا باپ کا دست و بازو بن گیا اور دونوں نے مل کر توحید کے عظیم ترین مرکز یعنی کعبۃ اللہ کی دیواریں اٹھائیں جسے قرآن نے "البیتُ العتیق" بھی قرار دیا اور "اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ

لِلنَّاسِ" کا مصداق بھی!

یہ مُقدّس معمارانِ حرم جن جذبات کے ساتھ تعمیر کر رہے تھے اُن کی عکّاسی قرآنِ حکیم کی ان آیات میں بتمام و کمال کی گئی ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ	اور جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیل بیت اللہ کی
مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا	دیواریں اُٹھا رہے تھے (تو کہتے جاتے تھے)
تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ	پروردگار ہمارے! قبول فرما ہم سے (ہماری
الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ	یہ خدمت) یقیناً تو سب کچھ سننے والا بھی ہے
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً	اور سب کچھ جاننے والا بھی۔ اور اے ربّ
مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠	ہمارے بنائے رکھ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار
(البقرہ ۱۲۷-۱۲۸)	اٹھا ہماری اولاد میں سے اپنی ایک فرمانبردار اُمّت

ادھر بوڑھا باپ اپنے جوان ہوتے ہوئے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جی رہا تھا اُدھر قدرت مسکرا رہی تھی۔ اس کے ترکشِ امتحان میں ابھی ایک تیر باقی تھا۔ دل کو چھید جانے والا اور جگر سے پار ہو جانے والا تیر! گویا ابھی آخری آزمائش باقی تھی، محبّت اور جذبات کی آزمائش اور ایک امتحان باقی تھا، اُمّیدوں، آرزوؤں اور تمنّاؤں کا امتحان!

حکم ہوا اپنے بیٹے کو قربان کر دو۔ زمین پر سکتہ طاری ہو گیا، آسمان لرز اُٹھا لیکن نہ بوڑھے باپ کے پائے ثبات میں کوئی لغزش پیدا ہوئی نہ نوجوان بیٹے کے صبر و تحمّل میں کوئی لرزش! دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا بقولِ سرمد:

سرمد گلہ اختصار می باید کرد!	یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا سر برضائے دوست می باید داد	یا قطع نظر ز یار می باید کرد

یہ دوسری بات ہے کہ عین آخری لمحے پر رحمتِ خداوندی حکمتِ امتحان پر غالب آ گئی اور بوڑھے باپ کی امتحان میں کامیابی کا اعلان کر دیا گیا بغیر اس کے کہ وہ اپنے اکلوتے کی ذبح شدہ لاشہ فی الواقع اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

سُورۂ صّٰفّٰت میں کتنے قلیل الفاظ میں صورتِ حال کی کتنی مکمّل تصویر کھینچ دی گئی ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝

توجب وہ (بیٹا) اس (باپ) کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے کے قابل ہوا تو اُس نے کہا "میرے بچے! مَیں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھیں ذبح کر رہا ہوں، تو تمھاری کیا رائے ہے؟" اُس نے جواب دیا "ابّا جان! کر گذریئے جو حکم آپ کو مل رہا ہے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صابر و شاکر پائیں گے" پھر جب دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس نے اُسے پیشانی کے بل پچھاڑ دیا تو ہم نے پکارا "اے ابراہیم! (بس کر) تو نے خواب پورا کر دکھایا۔ ہم المحسنین کو ایسا ہی جزا دیا کرتے ہیں نیکوکاروں کو۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی!" (الصّٰفّٰت: ۱۰۲ تا ۱۰۶)

گویا جس کا امتحان لیا جا رہا تھا اُس نے ہمّت نہ ہاری، ممتحن ہی کو بس کرنا پڑی جس نے نہ صرف یہ کہ اس وقت بیٹے کی جگہ مینڈھے کی قربانی بطورِ فدیہ قبول کر لی بلکہ اس کی یادگار کے طور پر ہمیشہ ہمیش کے لیے قربانی کا سلسلہ جاری فرما دیا، بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝

(الصّٰفّٰت: ۱۰۷-۱۰۸)

اور اس کے بدلے میں دی ہم نے ایک بڑی قربانی۔ اور یادگار رکھا ہم نے اُس پر (چلن) پچھلوں میں!

اور اس طرح امتحان اور آزمائش کی ایک طویل داستان کمال کو پہنچی اور عقل و فطرت کی سلامتی اور سیرت و کردار کی پختگی کی کٹھن جانچ پرکھ اور جذبات و احساسات کے ایثار اور محبّت کی قربانی کے مشکل امتحانات سے گذر کر اللہ کا ایک بندہ ایک طرف خُلّتِ الٰہی کی خلعت سے سرفراز ہُوا اور دوسری طرف امامتُ النّاس کے منصب پر فائز ہوا۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

سلام ہو ابراہیم پر! اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو، یقیناً وہ ہمارے صاحبِ یقین بندوں میں سے تھا۔

گویا یہ ہے ایک سچے مسلمان کی زندگی کی کامل تصویر اور 'ایمانِ حقیقی' کی صحیح تعبیر بقول مولانا محمد علی جوہر ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

اور بقول علامہ اقبال

چوں می گویم مسلمانم، بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لَا اِلٰہ را

سورۂ حج میں حج کے دو ہی بنیادی ارکان کا ذکر ہے[1] : ایک اللہ کے نام پر جانوروں کی قربانی اور دوسرے طوافِ بیتُ اللہ اور ان میں سے بھی زیادہ زور اور تکرار و اصرار قربانی ہی پر ہے بفحوائے آیاتِ مندرجۂ ذیل :

۱- وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ (الحج: ۲۷ تا ۲۹)

اور صدا لگا لوگوں میں حج کے لیے، کہ آئیں تیرے پاس پاپیادہ یا دُور دراز سے گہری وادیوں میں سے ہو کر آنے والے دُبلے اونٹوں پر۔ تاکہ حاضر ہوں اپنے منافع کے مقامات پر اور لیں اللہ کا نام معیّن دنوں میں، ان جانوروں کو ذبح کرتے ہوئے جو ہم نے اُن کو دیئے ہیں۔ پھر کھاؤ ان میں سے خود بھی اور کھلاؤ بے کسوں اور محتاجوں کو بھی۔ پھر وہ دُور کریں اپنا میل کچیل، اور پُوری کریں اپنی نذریں اور چکّر لگائیں ہمارے قدیم گھر کا!

۲- وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا

اور ہر اُمّت کے لیے مقرّر کر دیا ہے ہم نے

لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (الحجّ: ۳۴)

قربانی کا سلسلہ، تاکہ لیں نام اللہ کا ان چوپایوں کو ذبح کرتے ہوئے جو عطا کیے ہیں ہم نے ان کو۔

۳۔ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (الحجّ: ۳۶)

اور کعبے کی نذر کے اُونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے اللہ کے شعائر میں سے ٹھہرایا ہے۔ اس میں تمھارے لیے بھلائی ہے، سو لو نام ان پر اللہ کا ان کو قطار میں کھڑا کر کے پھر جب ٹھہر جائیں وہ کروٹ کے بل تو کھاؤ ان میں سے خود بھی اور کھلاؤ صابروں اور بے قراروں کو بھی! اسی طرح ہم نے دے دیا ہے اُن کو تمھارے بس میں تاکہ تم شکر کرو اللہ کا!

ان میں سے جہاں تک طوافِ بیتُ اللہ کا تعلّق ہے ظاہر ہے کہ وہ تو صرف مکّہ مکرّمہ ہی میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ البتّہ قربانی کو عید الاضحیٰ کی صورت میں رُوئے زمین کے ان تمام لوگوں کے لیے عام کر دیا گیا جو اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی راہ اختیار کر کے گویا ابراہیمؑ ہی کی معنوی ذُرّیّت میں شامل ہو گئے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ اُن کا کوئی صلبی و نسلی تعلّق ان سے ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایک روایت کی رُو سے جسے زید ابن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام احمد ابن حنبل اور امام ابن ماجہ رحمہما اللہ نے اپنی اپنی مسند میں نقل کیا ہے، آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! ان قربانیوں کی نوعیّت کیا ہے؟" تو جواباً آپؐ نے ارشاد فرمایا: "یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کی سُنّت ہے!" ——— گویا بھیڑوں، بکریوں، گایوں اور اونٹوں کی قربانی اصلاً علامت کی حیثیّت رکھتی ہے اطاعت و فرمانبرداری اور تسلیم و انقیاد اور اس پر مداومت و استقامت کی اس رُوح کے لیے جو حضرت ابراہیم علیٰ نبیّنا و علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی پوری شخصیّت میں رچی بسی ہوئی تھی اور ان کی پوری زندگی میں جاری و ساری رہی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں متذکرہ بالا آیات کے متصلاً بعد ہی متنبہ فرما دیا گیا تھا کہ:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا	اللہ تک نہیں پہنچتا ان قربانیوں کا گوشت
دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى	یا خون ——— ہاں اُس تک رسائی ہے
مِنْكُمْ (الحج - ۳۷)	تمہارے تقویٰ کی!

یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح ہم نے دین کے دوسرے تمام حقائق کو محض رسموں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ جس کا مرثیہ کہا ہے علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں کہ ؎

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالیؓ نہ رہی — فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالیؒ نہ رہی!

اسی طرح قربانی کی روح بھی آج نام نہاد مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت کے عمل ہی سے نہیں وہم و خیال سے بھی غائب ہو چکی ہے اور اب اس کی حیثیت بعض کے نزدیک محض ایک رسم کی ہے اور اکثر کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کر صرف ایک قومی تہوار کی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہر سال پندرہ لاکھ سے بھی زائد کلمہ گو حج کرتے ہیں اور بلا مبالغہ کروڑوں کی تعداد میں جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے لیکن وہ روحِ تقویٰ کہیں نظر نہیں آتی جس کی رسائی اللہ تک ہے!

کاش کہ ہم جرأت کے ساتھ موجودہ صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کر سکیں اور اصل رُوحِ قربانی کو اپنی شخصیتوں میں جذب کرنے پر کمرِ ہمت کس لیں، اور عیدِ قربان پر جب اللہ کے لیے ایک بکرا یا دنبہ ذبح کریں تو ساتھ ہی عزمِ مصمم کر لیں کہ اپنا تن من، دھن اُسؐ کی رضا پر قربان کر دیں گے ——— گویا بقولِ شاعر ؏

"میرا سب کچھ مرے خُدا کا ہے!"

اور بفحوائے الفاظِ قرآنی:

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ اٰمِيْنَ ۔ يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ایک مکتوب

باسمہٖ سُبحانَہٗ

محترمی زاد عنایتکم ! وعلیکم السّلام ،

گرامی نامہ کل ہی ملا - یاد آوری اور ذرّہ نوازی کا شکر گزار ہوں - اگرچہ میرا دل ہر وقت آپ سے ہم کلامی کے لیے ترستا رہتا ہے - لیکن آپ کی مصروفیت اور آپ کے وقت کی اہمیّت کے پیشِ نظر جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ کے قیمتی وقت کو ضائع کروں دگرنہ دل را بہ دل رہیست والا معاملہ ہے -

'میثاق' ستمبر، اکتوبر کے شمارہ کو کئی دفعہ پڑھا اور حقیقت یہ ہے کہ ماہنامہ 'میثاق' کا ہر شمارہ مکرّر سہ کرّر پڑھ کر لطف اور بصیرت حاصل کرتا ہوں - اتنے ذوق و شوق سے دوسرے علمی و مذہبی رسالے نہیں پڑھتا - ستمبر، اکتوبر کے شمارے کی تفصیل سے مطمئن ہُوا - اور خاص کر اس ذرّہ نوازی کا شکر گزار ہوں کہ مجھ جیسے ہیچمدان کے خیالات کو آپ نے پذیرائی بخشی اور درج فرمایا -

مہینہ ختم ہونے کے بعد 'میثاق' کے انتظار میں رہتا ہوں - حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے قلم سے نکلتا ہے وہ بہت ہی قیمتی اور مؤثّر مواد ہوتا ہے - دعا ہے کہ خدا آپ کو اس خدمتِ قرآن اور اصلاحِ مسلمین کے لیے ہمّت ، صحّت اور عمرِ خضر عطا فرمائے - آمین

مَیں عمر کے اس موڑ (اٹھترواں سال شروع ہے) پر صحّت کے لحاظ سے کمزور اور قدرے دماغی پریشانی کی وجہ سے مضمحل سا ہو گیا ہوں ع لبے سخنی کہ درگیتی کشیدی والا معاملہ ہے -

"تدبّرِ قرآن" کی چوتھی جلد کا انتظار صبر آزما ہو گیا ہے - والسّلام

نیازمند شیر بہادر خان

(ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی ، ایبٹ آباد)

مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر

تدبرِ قرآن

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب تفسیر ماجدی کی نظر میں

"بڑی ہی فکر انگیز اور اپنے رنگ میں بالکل منفرد تفسیر"

حسنِ معنوی سے قبل نظر کتاب کے جمالِ ظاہری پر پڑتی ہے اور جم جاتی ہے۔ کوئی تفسیر قرآن اتنی حسین و جمیل چھپی ہوئی دیکھنا یاد نہیں پڑتی۔ کاغذ، کتابت، چھپائی، جلد بندی ہر اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے ——— معنوی اعتبار سے قرآنیات کے محقق جلیل اور مصنف کے استاد علّام مولانا حمید الدین فراہیؒ گویا از سرِ نو دنیا میں آ کر اپنے افادات بجائے عربی کے سلیس اُردو میں قلمبند فرما گئے ہیں۔ قرآن مجید کے پہلو اور گوشے اتنے متعدد ہیں کہ کسی مفسر کے بس میں نہیں کہ ان سب کا بلکہ بیشتر کا بھی احاطہ کر سکے۔ لامحالہ اسے کسی ایک نہ ایک نقطۂ نظر کا انتخاب کر لینا ہوتا ہے اور اسکے فضل و کمال کیلئے یہی بہت ہے کہ وہ اسی محدود دائرہ میں کامیاب ہو جائے۔ مصنف کا اصل موضوع اپنے استاد ہی کی طرح نظم قرآن ہے۔ ایک عمر انہوں نے قرآن کے اسلوبِ بلاغت ہی پر غور و تدبر میں گزار دی ہے اور قرآن کو جو کچھ سمجھا ہے کہنا چاہئیے کہ وہ قرآن ہی سے سمجھا ہے۔ اور بڑے بڑے لطیف و نادر نکتے اسی کلام بلاغت نظام سے نکالتے چلے گئے ہیں اور اس کے بعد انہوں نے تکیہ توریت و انجیل (عہد نامہ عتیق و جدید) پر کیا ہے۔ گو ایک نتیجہ اس تفرد کا یہ بھی نکلا ہے کہ بہت سی جگہ انہیں عام تفسیری مروجات کا ساتھ چھوڑ دینا پڑا ہے ——— غرض بہ حیثیت مجموعی یہ ایک بڑی ہی فکر انگیز اور اپنے رنگ میں بالکل منفرد تفسیر اردو میں آ گئی ہے۔ اہل علم و طلبۂ فن کے مطالعہ میں رہنے کے قابل اور بہتوں کے لیے ایک قابلِ قدر رہنما۔ مصنفؔ شبلی اور ندوہ کے سکول کے اہلِ قلم ہیں۔ عبارت متین و محکم، شستہ و سلیس، شاندار اور باوقار مولویانہ نہیں ادیبانہ...

مصنف زندگی بھر اور کچھ نہ کرتے صرف یہی ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑ جاتے تو بھی خدمت قرآن کا حق ادا کر جاتے۔

صدقِ جدید، لکھنؤ، یکم ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ

الحمد للہ کہ

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا

چوتھا ایڈیشن طبع ہو کر تیار ہو گیا ہے

قیمت فی نسخہ : دو روپے

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

حیدر آباد میں انجمن کی مطبوعات

حسب ذیل مقامات سے حاصل کی جا سکتی ہیں

(۱) مکتبہ اسلامیہ (۲) شمشاد بک ڈپو

کورٹ روڈ ، گاڑی کھاتہ

آئندہ کراچی میں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کی جملہ مطبوعات بشمول ماہنامہ 'میثاق'

کے لئے حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جائے

قاضی عبدالقادر 2/2-IZ A ناظم آباد، کراچی - ۱۸

(فون : ۶۱۳۳۷۷)

حسن اتفاق سے اس بار ھجری اور عیسوی سن تقریباً ساتھ شروع ھوئے ہیں
اور ان کے ساتھ ہی لاھور میں

ڈاکٹر اسرار احمد

کی قرآن مجید کے علم و حکمت کے نشر و اشاعت کی مساعی بھی آٹھ سال مکمل
کرکے نویں میں داخل ھوگئی ہیں اور اس وقت ان کے

درس قرآن کی مستقل ھفتہ وار نشستوں

کا پروگرام حسب ذیل ہے :

(۱)

ھر جمعرات کو بعد مغرب برکت علی اسلامیہ ھال میں

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا نصف آخر زیر درس ہے

(۲)

ھر جمعہ کو قبل جمعہ (۱ بجے) جامع مسجد نیو یونیورسٹی کیمپس میں

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ابتداء سے زیر درس ہے

(۳)

ھر ھفتہ کو بعد عصر مسجد دارالسلام باغ جناح میں

قرآن حکیم سورۂ بنی اسرائیل سے آگے سلسلہ وار زیر درس ہے

(۴)

ھر اتوار کو صبح ۹ بجے ، مسجد شہداء ریگل چوک میں

قرآن حکیم ابتداء سے سلسلہ وار زیر درس ہے
(حال ہی میں تیسرے پارے کا آغاز ہوا ہے)

ع "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے"

المعلن

Regd. L. No. 7360

Monthly **MEESAQ** Lahore

Vol. 23 | JANUARY 1976 | No. 1

انشاءاللہ العزیز

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام تیسری سالانہ

قرآن کانفرنس

ٹاؤن ہال، لاہور میں

۲۱ - ۲۲ - ۲۳ مارچ ۷۶ء کو منعقد ہوگی

جس میں پاکستان بھر سے علماء و دانشور شرکت فرمائیں گے۔

سزید برآں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کا تیسرا سالانہ اجلاس عام

انشاءاللہ ۲۴ مارچ ۷۶ء کو شام کے ۵ بجے دفتر انجمن واقعہ ۱۲۔افغانی روڈ سمن آباد لاہور میں منعقد ہوگا۔

انجمن کے مؤسس و محسنین اور مستقل و عام ارکان مطلع رہیں۔

المعلن: ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور